کتاب بار بار پڑھنے کے لائق ہے، مولانا گو جسمانی لحاظ سے ہم سے دور ہو گئے ہیں، مگر اس کتاب کے ذریعہ انشاء اللہ ان کے روحانی فیض سے ہمیں برابر مستفیض ہونے کا موقع ملتا رہے گا،

عبدالرحمن ابن خلدون — صفحات ۳۲۵ از ڈاکٹر عبدالواحد وافی
جابر بن حیان — صفحات ۳۰۲ از ڈاکٹر زکی نجیب محمود
المعتمد ابن عباد — صفحات ۳۴۵ از علی ادہم

ناشر مکتبہ مصر ۲ شارع کامل صدقی الفجالہ،

یہ تینوں کتابیں جمہوریہ عربیہ کے شعبۂ ثقافتی معاملات کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، پہلی کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ابن خلدون کے حالات و علمی اور عملی کارناموں کی تفصیل ہے، دوسری کتاب میں مشہور فلسفی اور کیمسٹ جابر بن حیان کے حالات اور اس کے عملی کارناموں کا ذکر ہے، اور تیسری کتاب میں مغرب کے معروف شاعر و ادیب المعتمد ابن عباد کے ادبی و شاعرانہ کاموں اور خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے دائرہ میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، ان پر اس سے بھی زیادہ مفصل کتابیں لکھنے کی ضرورت تھی، پھر بھی عرب جمہوریہ کا شعبۂ ثقافت قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ان پر کام کی ابتدا کر دی ہے، یورپ نے اپنے زور قلم سے معمولی معمولی آدمیوں کی دلوں میں غیر معمولی اہمیت بٹھا دی ہے، مگر بدقسمتی ہے کہ تاریخ اسلام کی بعض بڑی بڑی شخصیتوں سے بھی دنیا ناواقف ہے، اس لحاظ سے یہ بڑا قابل قدر کام ہے۔

"م - ج"

جلد ۹۰ - ماہ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۲ء - عدد ۲

مضامین

شذرات

مجاہد ملت

جمعیۃ علمائے ہند کی آخری شمع بجھ گئی

جس حادثہ کا دھڑکا عرصہ سے لگا ہوا تھا بالآخر وہ پیش آہی گیا اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب ۲ اگست ۱۹۶۲ء کو صبح صادق کے وقت اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوگئے۔ موت کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، ہر وقت اسکا بازار گرم رہتا ہے، روزانہ ہزاروں لاکھوں انسان مرتے رہتے ہیں، مگر کسی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا، لیکن بعض موتیں وہ ہوتی ہیں جن سے ایک قوم اور ایک ملت کی پوری عمارت متزلزل ہو جاتی ہے، مولانا حفظ الرحمن صاحب کی رحلت بھی انہی میں ہے۔

فما کان قیس هلکه هلک واحد ولکنه بنیان قوم تهدما

ان کی موت سے ہماری قومی و ملی عمارت کا بہت بڑا ستون گر گیا، مولانا کی پوری زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ملک و ملت کی خدمت میں گذرا، حتی کہ مرض الموت میں بھی اس سے غافل نہ رہے، اور اپنی ان تھک محنت سے اس راہ میں جان تک دیدی، اس لیے اگر زندگی میں وہ مجاہد ملت تھے تو موت کے بعد شہید ملت ہیں۔

ان کی پوری زندگی ایک سعی پیہم اور جہد مسلسل تھی جس سے ان کو ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی نجات نہیں ملی، آزادی نے جنگ آزادی سے بھی زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے تھے، ایک طرف فرقہ پروری کا سیلاب تھا جو آزادی کے اصل مقصد ہی کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا، دوسری طرف مسلمانوں کے سنگین مسائل تھے، تیسری جانب ملکی و وطنی مصالح اور صحیح جمہوری اور سیکولر بنیادوں پر آزاد ہندستان کی تعمیر تھی، اس بحرانی دور میں ان سب سے عہدہ برآ ہونا

آسان نہ تھا، فرقہ پروری نے بڑے بڑے قوم پروروں کے قدم اکھاڑ دیے تھے، مگر اس وقت بھی مولانا صحیح قومی اصولوں پر قائم رہے اور ان سارے فرائض کو اس خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے کہ ان کا کوئی مخالف بھی حرف گیری نہیں کر سکتا۔

مسلمانوں کی اس بے بسی کے دور میں مولانا کی ذات بہت بڑا سہارا تھی، اور اس راہ میں ان کے کارنامے بے نظیر ہیں، ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو مسلمانوں کی مظلومیت اور حق تلفی پر اس جرأت و بیباکی کے ساتھ آواز بلند کر سکے اور وہ موثر بھی ہو، یوں تو زبانی شور و غوغا کرنے والے بہت ہیں، لیکن اس کی حیثیت صدا بصحرا سے زیادہ نہیں ہے، مولانا ہندوستان کی جنگ آزادی کے ممتاز سپاہیوں میں تھے، انھوں نے چوٹی کے لیڈروں کے دوش بدوش کام کیا تھا، ان کا دامن فرقہ پرستی کے داغ سے بالکل پاک تھا، ان کی پشت پر خدمات اور قربانیوں کی ایک پوری تاریخ تھی، اسلیے ان کی آواز میں قوت بھی تھی اور ایک حد تک اثر بھی تھا، ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت باقی نہیں ہے، ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے۔

ع افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

اس لیے ان کی موت ملک و ملت خصوصاً مسلمانوں کا ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی، اللہ تعالیٰ اس مجاہد ملت کے خدمات کو قبول اور عالم آخرت کی سربلندیوں سے سرفراز فرمائے۔ اللّٰھم صب علیہ شآبیب رحمتک و رضوانک۔

مسلمانوں کے معاملات میں حکومت کو کبھی کبھی اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے، اور وہ اسکی تلافی کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ پرائمری تعلیم کے نصاب میں ہندو تہواروں کی عملی تعلیم اور انکی رسوم کو ادا کرنے کا جو حصہ تھا جس میں مسلمان بچوں کو بھی شریک ہونا پڑتا، انجمن تعلیمات دین اور جمعیۃ العلماء کی کوشش سے نصاب سے خارج کر دیا گیا، حکومت نے یہ ایک دانشمندانہ کام کیا ہے جسکا مسلمانوں کو اعتراف کرنا چاہیے، اگر پرائمری ریڈروں میں مسلمانوں کے عقائد و تصورات کے خلاف جو چیزیں ہیں انکے نکالنے کا مرحلہ بھی باقی ہے، ہم کو توقع ہے کہ اس میں بھی حکومت اسی دانشمندی کا ثبوت دیگی، یہ

مسلمانوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہے، بلکہ اس سے خود حکومت کی جمہوریت اور سیکلرزم کا وقار قائم ہوتا ہے اور مسلمانوں کو بھی اس کا احساس ہوتا ہے کہ حکومت انکے جذبات کا بھی لحاظ رکھتی اور ان کو اپنا شہری سمجھتی ہے،

مگر اردو کے بارہ میں انکی روش میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، زبانی وعدے تو برابر ہوتے چلے آرہے ہیں، کبھی کبھی اردو کے بارہ میں کوئی سرکلر بھی جاری ہو جاتا ہے، مگر جب تک اردو کے حقوق کو قانونی حیثیت نہ دیجائیگی اور اسکی بنیادی تعلیم کا مکمل انتظام نہ کیا جائیگا محض زبانی وعدے اور تحریری ہدایات بالکل بے نتیجہ ہیں، انکی پابندی پر عمال حکومت کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، اسکا نتیجہ یہ ہے کہ اردو روز بروز ختم ہوتی جاتی ہے، اردو کی حیثیت اتنی گرادی گئی ہے کہ اس سے مستقبل میں کسی فائدے کی امید نہیں ہوتی، اسلیے طلبہ کیلئے اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی ہے، دوسرے پرائمری اسکولوں سے اردو بالکل ختم کردی گئی ہے، ان سے بڑھکر جو طلبہ نکلتے ہیں ان کو آیندہ اردو لینے میں دشواری پیش آتی ہے، اس لیے مسلمانوں کے کالجوں اور اسکولوں میں بھی جہاں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے، اردو کے طلبہ کی تعداد برابر گھٹتی جاتی ہے، اس میں ایک حد تک ان طلبہ اور انکے سرپرستوں کا بھی قصور ہے، جو اردو کی تعلیم کو بھی ذاتی فائدے کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، کچھ چیزیں ذاتی فائدے سے بلند ہوکر قومی نقطۂ نظر سے بھی دیکھی جاتی ہیں، اردو کی تعلیم کا یہی فائدہ کیا کم ہے کہ اس سے اردو زبان زندہ رہے گی،

اس بارہ میں ہم کو حیدرآباد کے اردو دوستوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے، گو عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو کا خاتمہ ایک بڑا سانحہ ہے، لیکن اس سے وہاں کے حامیان اردو ہمت نہیں ہارے، اور اس کے لیے برابر جد وجہد کرتے رہے، اور اردو دنیا کو یہ سنکر مسرت بھی ہوگی اور حیرت بھی کہ انکی کوششوں سے حیدرآباد میں ایک اردو کالج قائم ہوگیا ہے جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہوگی، عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی اس کالج کو تسلیم کرلیا ہے اور اس کے نصاب کی کتابیں مرتب ہو رہی ہیں، انجمن ترقی اردو حیدرآباد اور عثمانیہ یونیورسٹی دونوں اس کارنامے پر مبارکباد کی مستحق ہیں، ہمارے صوبے کے اردو کارکنوں اور یہاں کی یونیورسٹیوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

مقالات

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے

(۵)

مشائخ اور سلاطین

سلاطین صوفیۂ[1] کرام کے آستانوں پر برابر جھکتے رہے، مشہور ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہی کی دعوت پر شہاب الدین غوری ہندوستان آیا، التتمش حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مرید تھا، اور رات کو ان کے پاؤں بھی دابتا تھا، حضرت جلال الدین تبریزیؒ دہلی تشریف لائے تو اس نے خدم وحشم کے ساتھ دہلی سے باہر جاکر ان کا استقبال کیا، قاضی قطب الدین کاشانیؒ اس کے دربار میں آئے تو ان کو اپنے پہلو میں بٹھایا، اسی طرح دربار میں قاضی حمید الدین ناگوریؒ کا خیر مقدم تخت سے اتر کر کیا، اور ایک موقع پر ان کے قدموں پر بھی گر پڑا، بلبن اپنی شاہانہ شوکت وعظمت کے باوجود مشائخ کی بیحد تعظیم کرتا، اور حصول برکت کے لیے ان کے گھروں پر بے تکلف جاتا، وہ شیخ علی چشت کا بڑا گرویدہ تھا، ان کو لینے کے لیے چشت سے کچھ لوگ آئے،

---

[1] اس مقالہ کا یہ حصہ مئی اور جون ۶۲ء کے رسالہ جامعہ میں بھی شائع ہوا ہے، لیکن مزید اضافہ کے ساتھ معارف میں شائع کیا جارہا ہے،

تو اس نے ان کے قدموں پر گر کر ان کو چشت جانے سے روکا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی لڑکی بی بی ہزیرہ کو حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے حبالۂ عقد میں دیا تھا، اس لحاظ سے سلطان ناصر الدین محمود ان کا ہمزلف تھا، جلال الدین خلجی حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ کا مرید تھا، علاء الدین خلجی بعض اسباب کی بنا پر خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے مل تو نہ سکا، لیکن اس نے اپنے دونوں لڑکوں خضر خاں اور شادی خاں کو ان کے حلقۂ ارادت میں دیدیا اور جب حضرت خواجہ کی مجلس سماع کے اشعار اس کے سامنے دہرائے جاتے تو وہ ان کو آنکھوں سے لگاتا اور بار بار پڑھتا، قطب الدین مبارک خلجی سہروردیہ سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ ضیاء الدین رومی کا مرید تھا، سلطان محمد تغلق حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے پوتے حضرت شیخ علاء الدین کا مرید تھا، اس نے حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء کے جنازے کو کاندھا دیا اور ان کے روضۂ مبارک کی عمارت بنوائی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ اور حضرت شیخ رکن الدین ملتانیؒ کی خانقاہیں بھی اسی نے تعمیر کرائیں، سلطان فیروز شاہ تغلق بھی حضرت شیخ علاء الدینؒ اجودھنی کا مرید تھا، وہ مشائخ کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا، حضرت جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشتؒ اس کے دربار میں تشریف لاتے تو تخت پر ساتھ بیٹھتے، سلطان سکندر لودی حضرت سماء الدین کا مرید تھا، بابر حضرت عبد القدوس گنگوہی کے آستانہ پر خود حاضر ہوا تھا، اور حضرت گنگوہی نے بھی اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ سے اس کو نصیحت کی کہ وہ عدل قائم کرے، اوامر و نواہی کی پابندی کرے، نماز با جماعت ادا کرے اور علماء کو دوست بنائے، ہمایوں حضرت غوث گوالیاری کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا، اکبر کو شیخ سلیم چشتیؒ سے جو عقیدت رہی وہ اس کی زندگی کا اہم جزء ہے، ان ہی کی خاطر اس نے فتح پور سیکری کو تمام شہروں کا سرتاج بنا دیا، اس کو جب کبھی ملکی اور فوجی کاموں سے فرصت مل جاتی تو حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتی کے آستانہ پر حاضر ہوتا، میدان جنگ میں حضرت خواجہ سے حصول برکت کے لیے یا معین کا نعرہ بھی لگاتا، شہزادہ سلیم کی پیدائش کی خوشی میں حضرت خواجہ کے مزار پر حاضری دینے کے لیے آگرہ سے اجمیر تک

پاپیادہ گیا، جہانگیر تو حضرت شیخ سلیمؒ کے سایۂ عاطفت میں پلا، اس لیے وہ بزرگوں، درویشوں، حتیٰ کہ سنیاسیوں سے بھی بیحد عقیدت رکھتا تھا، کچھ دنوں اس کو حضرت مجدد الف ثانی سے اختلاف ضرور رہا، لیکن جب اس کی غلط فہمی دور ہوئی تو وہ حضرت مجددؒ کا بہت گرویدہ ہو گیا، ایک مشہور روایت ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ میرے پاس ایک دستاویز نجات ہے، اور وہ حضرت مجددؒ کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھکو جنت میں لیجائے گا تو تیرے بغیر نہ جاؤں گا، شاہ جہاں بچپن ہی میں حضرت مجددؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا تھا، عالمگیر نے سلوک و طریقت کی تعلیم حضرت مجددؒ کے صاحبزادے حضرت محمد معصومؒ سے پائی، فرخ سیر نے حضرت سید شاہ سلام اللہ سے بیعت کی، محمد شاہ رنگیلے کو شاہ مبارک، شاہ بدا، اور شاہ رمز سے بڑی عقیدت تھی، عالمگیر شاہ ثانی کا تعلق تو درویشوں سے اس کی غیر معمولی عقیدت مندی ہی کے سلسلہ میں ہوا، شاہ عالم کو حضرت شاہ فخر الدینؒ دہلوی سے بیعت تھی، بہادر شاہ ظفر بھی ان ہی کا مرید تھا، اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے مولانا قطب الدین سے بیعت کی، ان کا وصال ہوا تو ان کے خورد سال صاحبزادے غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب سے وہی عقیدت قائم رکھی،

صوفیہ سے عقیدت کے اسباب

سلاطین کا صوفیہ کے آستانے پر جھکنے کے کئی اسباب تھے، ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی دور حکومت میں اتنے جلیل القدر صوفیہ گذرے کہ وہ خواص و عوام دونوں کے دلوں پر چھائے رہے، ان کی درویشی میں شاہنشاہی تھی، ان کی قلندری میں شان سکندری تھی، سلاطین کے دربار میں "عجم کا حسن طبیعت" دکھائی دیتا تو ان بوریہ نشینوں کی خانقاہوں میں "عرب کا سوز دروں" ملتا تھا، ان کی حکمت ملکوتی اور علم لاہوتی سے لوگوں کے درد کا درماں ہوتا رہتا تھا، وہ شبنم بن کر جگر لالہ میں ٹھنڈک پیدا کر سکتے تھے، تو طوفان بنکر دلوں کو دہلا بھی سکتے تھے، اسی لیے وہ عوام و خواص کے مرجع بن گئے تھے، سلاطین بھی ان کا دامن پکڑنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے،

اس کے علاوہ بعض سلاطین علماء کی سخت گیریوں سے گھبرا جاتے تو ان کو صوفیائے کرام کے

روحانی دامن میں پناہ ملتی تھی، صوفیہ کرام ظواہر کی پابندی میں سختی کرنے کے بجائے سلاطین میں اسلام کی اخلاقی اور باطنی روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے، اس سے کبھی کبھی شریعت کی گرفت تھوڑی ڈھیل ضرور ہو جاتی، لیکن اسلام کے باطنی مزاج کا استیلا ان پر قائم رہتا، جس سے غیر شعوری طور پر حکومت و سلطنت کو فائدہ پہنچتا، التتمش جیسے دیندار بادشاہ کے دربار میں مولانا سید نورالدین مبارک غزنوی نے یہ وعظ کہنے میں تامل نہیں کیا کہ بادشاہوں کی زندگی کے جو لوازم ہیں، جس طرح سے وہ کھاتے ہیں، جو کپڑے پہنتے ہیں، جس طرح وہ اٹھتے بیٹھتے اور سواری کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ وہ تمام چیزیں دین مصطفےٰ کے خلاف ہیں، لیکن حضرت بختیار کاکیؒ اپنے مرید سلطان التتمش کو شاہانہ شوکت و حشمت ترک کرنے کی تلقین کے بجائے اس کو خدا ترسی، پارسائی، تزکیۂ نفس، غمخواری دین، عدل پروری اور خدمت خلق کی تعلیم دیتے رہے، سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار کی نمائش، خود پرستی اور فرکیشہ دری کو علما، رسوم جبابرہ کہتے رہے، وہ دربار کی ظاہری نمود و نمائش میں عجمی فرمانرواؤں کی تقلید کرتا تھا جس کا رنگ مشرکانہ تھا، لیکن وہ اپنے عہد کے تمام اکابر بزرگان دین سے فیوض و برکات حاصل کرتا رہا، اس کی درباری زندگی خواہ کیسی ہی رہی ہو لیکن اس کو حمیت اسلام اور شعار اسلام کا بڑا خیال رہا، اسی لیے صوفیہ بھی اس کا احترام کرتے، اس کے مرنے کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور دوسرے مشائخ جب اس کا نام لیتے تو اسکے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ، طاب اللہ ثراہ اور نور اللہ مرقدہ بھی کہتے، جو عموماً صلحا، اور اخیار کے نام کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں، اس کے دربار کے بعض مشرکانہ رسوم کے باوجود خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے اس کے مذہبی عقائد کی تعریف کی ہے،

حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں شب برات کی جو تقریبات منائی جاتی ہیں وہ غزنین، خراسان اور عرب میں دیکھنے میں نہیں آئیں، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا کوئی تعلق مسلمانوں سے نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کے عوام سے ہے جو دین سے بے خبر ہیں، اور وہ اس رات غیر شرعی چیزوں میں مشغول رہ کر اپنے اعمال کو سیاہ کرتے ہیں،

وہ فیروز شاہ تغلق سے برابر ملتے رہے، جس نے ان سے مذہبی اور روحانی فیوض حاصل کیے لیکن اس کے دربار میں شب برات کی تقریب بہت دھوم دھام سے منائی جاتی، بے شمار مشعلیں روشن کیجاتیں طبل بجتے، آتشبازی کے طرح طرح کے تماشے ہوتے، مگر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سلطان کی اس شاہانہ تقریب کو ختم کر دینے پر مصر نہیں ہوئے،

سلاطین پر صوفیہ کے اثرات صوفیہ کرام اور سلاطین کی پیری مریدی محض رسمی اور روایتی نہیں رہی، سلاطین کے مذہبی خیالات و جذبات کے نشو و نما میں ان بزرگوں کے فیوض و برکات کا بڑا دخل رہا، شمس الدین التتمش حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کا مرید بنکر ویسا ہی فرمانروا ہوا جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ وہ راتوں کو جاگتا، کسی نے اس کو سوتے نہیں دیکھا، وہ بیدار ہو کر عالم تحیر میں کھڑا رہتا، اور اگر سو جاتا تو بیدار ہو جاتا، اٹھکر وضو کرتا اور مصلے پر جا بیٹھتا، وہ ہمیشہ نماز باجماعت میں تکبیر اولی سے شریک ہوتا، عصر کی سنتیں کبھی قضا نہیں کیں، ان ہی خوبیوں کی وجہ سے اس کو حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے جنازہ کی نماز پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی، عصامی نے فتوح السلاطین میں اس کو صاحب ولایت، پارسا، صاحب شرع فرمانروا، غمخوار دین، خسرو دیں پناہ، خسرو پاک دیں اور خوش نفس وغیرہ جیسے القاب سے یاد کیا ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے بھی اپنے ملفوظات میں اس کا ذکر جا بجا عزت و احترام اور لطف و محبت سے کیا ہے، بلکہ اس کے بعض قول اور فعل کو بطور نصیحت اپنے مریدوں کے سامنے نقل بھی کیا ہے،

سلطان ناصر الدین محمود پر اپنے باپ سلطان شمس الدین التتمش کا بڑا اثر تھا، اسی لیے اس کو نہ صرف علماء سے محبت بلکہ مشائخ سے بھی مودت تھی، تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ اس کو حضرت بابا گنج شکرؒ سے بڑی عقیدت تھی، اور اگر یہ روایت تسلیم کر لیجائے کہ وہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کا ہم زلف تھا تو ظاہر ہے کہ ان سے اس نے بڑا استفادہ کیا ہوگا، اس کے حب رسول، للہیت، مروت اور دوسرے اوصاف حمیدہ کے قصے بہت مشہور رہیں ہیں، مورخوں نے لکھا ہے کہ اس سلطان کے عجیب و غریب قصے خلفائے راشدین کے حالات زندگی سے ملتے جلتے ہیں،

اس نے گو بائیس برس تک حکومت کی، لیکن اس کی زندگی میں درویشانہ شان برابر قائم رہی، دربار عام میں آتا تو شاہانہ لباس میں ملبوس رہتا، لیکن دربار ختم کرنے کے بعد پھٹے پرانے کپڑے پہن لیتا، اس کا زیادہ تر وقت عبادت، ریاضت، تلاوت کلام پاک، شب بیداری اور ذکر اللہ میں گذرتا، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے اس کے نام کے ساتھ بھی انار اللہ برہانہ اور رحمۃ اللہ علیہ کے تعظیمی الفاظ استعمال کیے ہیں۔

غیاث الدین بلبن پر حضرت شیخ علی چشت، حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ اور دوسرے مشائخ کا بڑا اثر رہا، اور ان ہی کی صحبت کا اثر تھا کہ مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ وہ عبادت، ریاضت، روزے، نفل اور شب بیداری میں غیر معمولی اہتمام رکھتا، نماز باجماعت پڑھتا، جمعہ کی نماز مسجد میں ادا کرتا، اشراق وچاشت، اوابین اور تہجد کی بھی پابندی کرتا، خواہ کوئی موسم ہو رات کو جاگتا، سفر و حضر میں اوراد و وظائف کو نہ چھوڑتا، کبھی بے وضو نہ رہتا، مشائخ کی بیحد تعظیم کرتا، ان میں سے کسی کا انتقال ہو جاتا تو ان کے جنازہ میں شریک ہوتا، پھر ان کے سوئم میں شرکت کرتا،

جلال الدین خلجی کو نہ صرف حضرت بوعلی قلندرؒ بلکہ تمام مشائخ سے بھی بڑی عقیدت رہی، اور اس میں غیر معمولی حلم، خدا ترسی، لینت و نرمی ان ہی کے اثرات سے پیدا ہوئی، مولانا ضیاء الدین کا بیان ہے کہ ایسا حلیم، کریم اور خدا ترس بادشاہ کوئی اور نہیں ہوا،

علاء الدین خلجی کسی کا مرید تو نہ تھا، لیکن ایک بار حضرت بوعلی قلندرؒ نے اس کو شحنۂ دہلی لکھ کر یاد کیا، تو وہ خوش ہوا، پھر دوسری بار انھوں نے اس کو فوطہ دار دہلی لکھا تو اس نے کہا کہ اس کے لیے میں شکر ادا کرتا ہوں، وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی زیارت سے تو محروم رہا، لیکن ان کی دعاؤں کا برابر طلب گار رہا، مورخین اس کی تصویر اچھی نہیں پیش کرتے، لیکن حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ اس کے متعلق بری رائے نہیں رکھتے، ان کے ملفوظات کے کاتب شیخ حمید شاعر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین خلجی کے مرنے کے بعد اس کی قبر لوگوں کے لیے زیارت گاہ بن گئی تھی، اور لوگوں کا عام عقیدہ تھا

جو کوئی اپنی مراد کی ڈوری اس کے مزار پر باندھے گا، اللہ تعالیٰ حاجتیں بر لائے گا، حضرت امیر خسروؒ تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ علاء الدین نے رحمت خداوندی کی نشانیوں کو مصحف وجود کی جلد میں جمع کر دیا تھا، امیر حسن سجزی تو اس کو اپنے اشعار میں دین پرور، دین پناہ اور اسلام پرور وغیرہ کے القاب سے یاد کرتے ہیں، عصامی نے بھی اس کو شاہ دین پرور لکھا ہے، عام طور سے علاء الدین خلجی سے متعلق جو واقعات مشہور ہیں ان کی تاریخی شہادتوں کے بعد علاء الدین کی مذکورہ بالا تعریف و توصیف بظاہر مبالغہ آمیز معلوم ہوگی، لیکن علاء الدین کے معاصروں کے ان بیانات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا،

مولانا ضیاء الدین برنی سلطان محمد تغلق کے بہت بڑے ناقد تھے لیکن وہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ سلطان کے کردار میں دو خاص باتیں تھیں، خدا کی بندگی اور بڑوں کی نیازمندی، نیازمندی سے مراد ہے کہ وہ درویشوں اور بزرگوں کی صحبت کا بڑا گرویدہ رہا، اور ان کی برابر سرپرستی کی، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ اس کی بعض باتیں ایسی تھیں جن کو سننے کے بعد عجائبات معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ شریعت کا پابند تھا، نماز کی بڑی تاکید کرتا تھا، جو نہیں پڑھتا اس کو سزا دیتا، وہ منجملہ ان بادشاہوں کے ہے جن کی نیک بختی اور مبارک نفسی حد سے بڑھی ہوئی تھیں، اس کی بے حد خواہش رہی کہ مشائخ اور صلحا اس سے تعاون کر کے حکومت کو سنوارنے میں امداد کریں، اسی لیے اپنے مرشد شیخ علاء الدین اجودھنیؒ کے ایک صاحبزادہ شیخ معز الدین کو گجرات کا ایک معزز عہدیدار بنا کر وہاں روانہ کیا، جہاں وہ شہید ہوئے، حضرت علاء الدین کے دوسرے صاحبزادے شیخ علم الدین کو ہندوستان کا شیخ الاسلام بنایا، خواجہ کریم سمرقندی (بابا فریدالدین کی نواسی کے شوہر) کو شیخ الاسلام بنا کر ستگاؤں بھیجا، اس نے سہروردیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ رکن الدین کو سو گاؤں جاگیر کے طور پر دیے،

شمس سراج عفیف نے لکھا ہے کہ فیروز شاہ تغلق اپنے پورے عہد حکومت میں اولیائے کرام کی متابعت کرتا رہا، ہر وقت مشائخ کی محبت میں ان کی پیروی کی، اور آخر زمانے میں مخلوق بھی ہو گیا تھا،

علماء و مشائخ ہر وقت اس کے پاس رہتے، اس لیے اس کو ہمیشہ مکروہ و حرام اشیاء کا علم رہتا تھا، اور ان ہی کے فیوض سے اس میں شریعت اور سنت کی پیروی کا جذبہ پیدا ہوتا رہا، وہ پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا، روزانہ کلام پاک کی تلاوت کرتا، جمعہ کے دن سورۂ کہف اور جمعہ کی رات میں سورۂ طٰہٰ بلا ناغہ پڑھتا تھا،

لودی سلاطین میں سکندر لودی حضرت سماء الدینؒ کا مرید تھا، اور ان کے مرید شیخ جمالی کی صحبت سے برابر فیضیاب رہا، اور ان بزرگوں کے اثر سے پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا، نفلیں بہت پڑھا کرتا تھا، صبح ہونے سے تین گھنٹے پہلے وہ جاگتا، غسل کرتا، تہجد کی نماز پڑھتا، اور پھر قرآن کے تین پارے ہاتھ باندھ کر اور کھڑے ہو کر پڑھتا تھا،

پہلے ذکر آچکا ہے کہ ہمایوں صوم و صلوٰۃ کا بہت پابند تھا، اور حسن ادب کا یہاں تک لحاظ رکھتا کہ بے وضو اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیتا،

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کا شمار اکابر صوفیہ میں نہیں ہوتا، لیکن یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہے اکبر کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیکر دیندار اور اسلامی عزت و ناموس کا نگہبان بنائے رکھا، اور اب یہ الزام کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ایک صوفی نے تو اس کو صحیح راستہ پر لگائے رکھا لیکن علماء کے ایک گروہ نے اس کو اسلام سے بدظن کر کے ایک غلط راستہ پر لگا دیا، جہانگیر کو حضرت سلیم چشتیؒ سے مستفیض ہونے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اس کے بچپن ہی میں ان کا وصال ہو گیا تھا، لیکن وہ ان کی صاحبزادی کی گود میں پلا، جنہوں نے اس کو دودھ بھی پلایا، اور وہ ان ہی کو اپنی ماں تصور کرتا رہا، اسی لیے اس کو اپنی ماں مریم زمانی سے کم لگاؤ رہا، اس کی رضاعی ماں کا انتقال اس کے آٹھویں سال جلوس میں ہوا تو ان کے جنازے کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر کچھ دور لے گیا، اور خود اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ کئی روز تک ان کی جدائی کے غم میں کھانے پینے اور کپڑے بدلنے کی خواہش نہیں ہوئی، اس کے بچپن کا ماحول

مذہبی تھا، اس لیے اکبر کی بے راہ روی کے باوجود اس میں اسلامی غیرت و حمیت کا بڑا جذبہ رہا، اسی لیے آخر میں وہ حضرت مجدد الف ثانی کا بھی معتقد ہو گیا، اور ان کی ایمانی حرارت اور جہانگیر کی مذہبی غیرت کے تعاون سے اسلام کی شمع جو اکبر کے دور میں زرد پڑ چکی تھی، پھر سے منور ہو گئی، خود شاہجہان کی مذہبیت حضرت مجدد الف ثانی کے فیوض کا نتیجہ تھی، کیونکہ وہ بچپن ہی میں ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا تھا، اور عالمگیر تو مجددی تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ہی بن گیا تھا،

صوفیۂ کرام کی تلقین

کسی بادشاہ وقت کا محض مذہبی ہونا اس کے اچھے حکمراں ہونے کی دلیل نہیں، مذہبی ہونے کے ساتھ اس میں حکمرانی کے تمام اوصاف بھی موجود ہوں، تو وہ پھر ایک قابل قدر حکمراں ہے، اسی لیے صوفیہ کرام نے سلاطین کی تعلیم و تربیت اپنے عام مریدوں سے مختلف انداز میں کی، اور خلق اللہ کی حاجت برآری اور عام عدل پروری پر زیادہ زور دیا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عام تعلیم تھی کہ حاجتمندوں کی مدد کرنے والا اللہ کا دوست ہے، اگر کوئی شخص اوراد و وظائف میں مشغول ہو، اور کوئی حاجت مند آجائے تو لازم ہے کہ وہ اوراد و وظائف کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو، اور اپنے مقدور کے مطابق اس کی حاجت پوری کرے، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ سلطان التتمش کو برابر رعایا، فقیروں، غریبوں اور درویشوں کے ساتھ دوستی کی تلقین فرماتے رہے،

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ بھی مظلوموں کی حمایت کی تلقین کرتے رہے، اجودھن کے ایک عامل کو شکایت تھی کہ وہاں کا والی اس پر مہربان نہیں ہے، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے اس کی سفارش والی سے کی لیکن والی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، حضرت گنج شکر نے عامل سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح میں نے تمھاری سفارش والی سے کی اور اس نے نہ سنی، اسی طرح تم سے بھی کسی نے کسی مظلوم کی سفارش کی ہوگی اور تم نے نہ سنی ہوگی، یہ سن کر عامل متاثر ہوا، اور ظلم کرنے سے توبہ کی، حضرت نظام الدین اولیاء صوم دہر کے باوجود افطار میں کوئی چیز چکھ لیتے، اس کے بعد سحری میں کچھ کھاتے اور

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اس وقت کچھ نہ کھاتے، خادم عرض کرتا کہ اگر آپ اس وقت میں کچھ نہ تناول فرمائیں گے تو کمزوری آجائے گی، قوت برقرار نہ رہے گی، یہ سن کر رو دیتے اور فرماتے کہ بھوکوں مسکینوں اور درویشوں کے فاقہ کو سوچتا ہوں تو حلق سے کھانا نیچے نہیں اترتا، پھر ایک اور موقع پر فرمایا کہ جو شخص اپنا غم و الم مجھ سے بیان کرتا ہے تو اس کو سنکر میرا رنج و غم دوچند ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں وہ لوگ کیسے ہیں جو دوسروں کے غم و الم کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور آہ نہ کریں۔ ان پر بڑا تعجب ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے کسی سلطان وقت سے تعلق تو نہیں رکھا، لیکن خلق اللہ کے ساتھ ان کی غمخواری کا اثر خواص و عوام دونوں پر رہا،

شمس سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ سلطان فیروز شاہ تغلق جب تخت نشین ہوا، تو حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے سلطان کو پیغام دیا کہ آپ وعدہ کریں کہ خلق اللہ کے ساتھ عدل و انصاف کریں گے، ورنہ ان بیکس بندوں کے لیے اللہ تبارک تعالیٰ سے دوسرا فرمانروا طلب کیا جائے سلطان نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں خداوند تعالیٰ کے بندوں سے حلم و بردباری کے ساتھ پیش آؤں گا اور ان پر انصاف و محبت سے حکومت کروں گا، حضرت شیخ نے یہ جواب سنا تو کہلایا کہ اگر آپ خلق اللہ کے ساتھ خلق و مروت سے پیش آئیں گے تو ہم بھی اللہ تبارک و تعالیٰ سے آپ کے لیے چالیس سال کی حکومت کے لیے دعا کریں گے، اور آخر کار وہی ہوا جو شیخ نے فرمایا تھا،

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے بھی فیروز شاہ تغلق کو اپنے مکتوب میں عدل و انصاف کی تلقین کی، اور اس کو ایک حدیث لکھ کر بھیجی کہ جو کوئی مظلوم کی مدد کرتا ہے، خدائے تعالیٰ قیامت کے روز پل صراط کو عبور کرنے میں اس کی مدد کرے گا اور بہشت میں جگہ دے گا، اور جو کوئی مظلوم کو دیکھتا ہے اور وہ مظلوم اس سے فریاد کرتا ہے، لیکن وہ فریاد نہیں سنتا تو قبر کے اندر اس کو آگ کے سو کوڑے مارے جائیں گے، پھر ایک دوسری حدیث یہ بھی تحریر فرمائی کہ جو کوئی مظلوم کی مدد کرتا ہے،

اس کے لیے تہتر مغفرت لکھی جاتی ہے، ان میں سے ایک تو اس کو دنیا میں مل جاتی ہے، اس سے اس کا کام سدھرتا ہے اور بقیہ بہتر عقبیٰ میں ملتی ہے، ایک تیسری حدیث اس کو یہ بھی لکھی کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے، ان کے ایک دوسرے مکتوب میں ہے کہ امراء اصحاب منصب اور ارباب قدر و منزلت کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچنے کا سب سے نزدیک راستہ یہ ہے کہ وہ عاجزوں کی دست گیری، اور حاجتمندوں کی حاجت روائی کریں، چنانچہ ایک بزرگ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پہنچنے کی راہیں تو بہت ہیں، لیکن سب سے نزدیک راہ دلوں کو راحت پہنچانا ہے۔ ان بزرگ سے یہ کہا گیا کہ جس شہر کے وہ رہنے والے ہیں اس کا بادشاہ شب بیدار ہے، نفل نمازیں بہت پڑھتا ہے، نفل روزے بھی رکھتا ہے۔ فرمایا بے چارے نے اپنے کام کو تو کھو دیا ہے، لیکن دوسروں کے کام میں لگا ہوا ہے۔ لوگوں نے ان بزرگ سے پوچھا کہ آخر اس بادشاہ کا اپنا کام کیا ہے، تو فرمایا کہ اس کا کام تو یہ ہے کہ طرح طرح کے کھانے پکوائے اور بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھلوائے، طرح طرح کے کپڑے سلوائے، اور ننگوں کو پہنوائے، اجڑے ہوئے دلوں کو آباد کرے، حاجتمندوں کی دست گیری کرے، نفل نمازیں پڑھنا اور نفل روزے رکھنا تو درویشوں کا کام ہے،

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ خود ایک مملکت کے حکمران رہ چکے تھے اس لیے اپنی درویشی کے زمانے میں حکمران طبقہ کو برابر نصیحتوں سے مستفید کرتے رہے، ایک ملفوظ میں تو فرمایا کہ جہانداری اور شہریاری کو چار چیزوں سے نقصان پہنچتا ہے (۱) سلاطین کا لذائذ دنیا میں مستغرق ہو جانا (۲) اپنے مقربین کے ساتھ بدخلقی سے پیش آنا (۳) سزا دینے میں زیادتی کرنا (۴) رعیت پر ظلم کرنا، اور پھر دوسرے ملفوظات میں بتایا کہ بادشاہ اپنے وقت کو اس طرح ترتیب دیں کہ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد اشراق تک وظیفہ پڑھیں، پھر علماء و صلحاء کے ساتھ صحبت رکھیں، اور چاشت کے وقت تک ان سے عدل و انصاف کے متعلق قرآنی آیتوں کے مطالب پوچھیں، اسی جگہ وزیروں اور ندیموں کو بلائیں اور ان لو

فوجوں کے جو معروضات پیش کریں ان کا مناسب جواب دیں، ہر شخص کے مدعا کو پورا کریں، اس کے بعد دربار عام ہو، جس میں رعایا اور مسلمانوں کے قضایا اور دعاوی پیش ہوں، اور شریعت کے مطابق انصاف کے ساتھ فیصلہ ہو...... عدل و انصاف کے اصول میں ایک نقطہ سے بھی انحراف نہ کریں، تاکہ سلطنت میں خلل واقع نہ ہو،

حضرت خواجہ گیسو درازؒ اپنی تصنیف خاتمہ میں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی بادشاہ راہ سلوک میں گامزن ہو تو سلطان ابراہیم ادہم، معاویہ ثانی اور عبد اللہ ابن زبیرؓ بن سکتا ہے، لیکن اگر کوئی بادشاہی کے لیے موزوں ہو تو پھر اسی فرض کو انجام دے، سلوک کی طرف مائل نہ ہو، اور حکومت میں ایسے متدین اور صالح لوگوں کو عہدہ دار مقرر کرے کہ جو شرعی احکام کو نافذ کرا سکیں اور فقیروں، کمزوروں، یتیموں، عاجزوں، لنگڑوں، گونگوں، بیواؤں کی پوری خبرگیری کریں، ان کو برباد ہونے سے بچا لینے سے زیادہ کوئی مشکل کام نہیں،

حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ نے سکندر لودی کو ایک مکتوب میں یہ لکھ بھیجا کہ ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر اور فاضل تر ہے، اور پھر اس کو ایک حدیث بھی لکھ بھیجی کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب شخص انصاف پسند امام ہوگا، اس لیے کہ اس کے عدل کی منفعت اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کے لیے تھی، پس وہ شخص ان سات آدمیوں میں سے ایک آدمی ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سایہ میں رکھے گا، اس دن اس سایہ کے علاوہ کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا، بابر کی حکومت قائم ہوئی تو حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ نے اس کو بھی ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ عالی ظرف لوگ دنیا کو آخرت کی ایک کھیتی سمجھتے ہیں، اور جو کچھ دنیا میں کرتے ہیں خدا ہی کے لیے کرتے ہیں؛ اللہ کے حکم کی تعظیم خلق اللہ کی شفقت سے وابستہ ہے، اور اسی پر عمل کرنے سے ابدی فلاح حاصل ہوتی ہے، آپ کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرنے کی خاطر لوگوں کے سروں پر عدل کا سایہ اس طرح

قائم کریں کہ کوئی شخص بھی کسی پر ظلم نہ کرے، حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ نے ہمایوں کو بھی اسی قسم کی تلقین کی۔

عدل پرور سلاطین

خدمت خلق اللہ اور عدل پروری کی مؤثر تعلیم اسلام نے دے رکھی ہے، مملوک سلاطین کی حکومت دہلی میں قائم ہوئی تو ان کے سامنے غزنوی اور غوری دربار کی عدل پروری کی روایات پہلے سے موجود تھیں، ہندوستان کے صوفیۂ کرام کی مزید تعلیم و تلقین نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا، اور شاید ہی کوئی فرمانروا ایسا گزرا ہو جو عدل پرور نہ رہا ہو، فخر مدبر کا بیان ہے کہ قطب الدین ایبک نے سخاوت میں حضرت ابوبکرؓ کی اور عدل میں حضرت عمرؓ کی تقلید کرنے کی کوشش کی، حضرت بختیار کاکی کے ملفوظات فوائد السالکین میں ہے کہ التتمش کی طرف سے عام اجازت تھی کہ جو لوگ بھی فاقہ کرتے ہوں اس کے پاس لائے جائیں، اور جب وہ آتے تو ان میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتا، اور ان کو قسمیں دیکر تلقین کرتا کہ جب ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہے یا ان پر کوئی ظلم کرے تو وہ یہاں آکر عدل و انصاف کی زنجیر جو باہر لٹکی ہوئی ہے، ہلائیں تاکہ وہ ان کے ساتھ انصاف کر سکے اور نہ قیامت کے روز ان کی فریاد کا بار اس کی طاقت برداشت نہ کر سکے گی، غیاث الدین بلبن کے بارہ میں مولانا ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ وہ دادو ہی اور انصاف پروری میں بھائیوں، لڑکوں اور مقربوں کا مطلق لحاظ نہ کرتا، اور جب تک مظلوم کے ساتھ انصاف نہ کر لیتا، اس کے دل کو آرام نہ پہنچتا، انصاف کرتے وقت اس کی نظر اس پر نہ ہوتی کہ ظلم کرنے والا اس کا حامی و مددگار ہے، اس کے لڑکے، اعزہ مخصوصین، والی، اور مقطع اس کی عدل پروری سے واقف تھے، اس لیے کسی کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ کسی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کریں، اس کے عدل و انصاف کے قصے بہت مشہور ہیں، خود اس زمانہ کے ہندوؤں نے اس کی حکومت کو دل کھول کر سراہا ہے، ۱۳۳۷ء بکرمی مطابق ۱۲۸۰ء کا ایک سنسکرت کتبہ پالم میں ملا ہے، جس میں لکھا ہے کہ بلبن کی سلطنت میں آسودہ حالی ہے، اس کی بڑی اور اچھی حکومت میں غور سے غزنہ اور ڈراوڈ سے رامیشورم تک ہر جگہ زمین پر بہار ہی بہار کی دل آویزی ہے، اس کی فوجوں نے ایسا امن و امان قائم کیا ہے جو ہر شخص کو

حاصل ہے، سلطان اپنی رعایا کی خبرگیری ایسی اچھی کرتا ہے کہ خود دشمن دنیا کی فکر میں آزاد ہو کر دودھ کے سمندر میں جا کر سو رہے ہیں، امیر خسرو علاء الدین خلجی کے بارہ میں خزائن الفتوح میں لکھتے ہیں کہ اس نے حضرت عمرؓ کے ایسا عدل قائم کر رکھا ہے اور عوام کے معاملات میں وہ المستنصر باللہ اور المستعصم بنا ہوا ہے۔

محمد بن تغلق کے بارہ میں سلاطین دہلی اور مغل بادشاہ کے دور کے مورخین لکھتے ہیں کہ وہ عدل نوازی کے سلسلہ میں مشائخ اور علماء کی بھی رو رعایت نہ کرتا، وہ اگر مجرم ہوتے تو ان کو بھی بلا تامل سزائیں دیتا، مسالک الابصار میں ہے کہ سلطان ہفتہ میں ہر شنبہ کو دربار عام منعقد کرتا، اور اس کے افتتاح کے موقع پر ایک نقیب بلند آواز سے پکارتا کہ مظلومین اپنی فریاد سنائیں، اہل حاجت اپنی ضرورتیں پیش کریں، جس کو کوئی شکایت ہو یا جو حاجت مند ہو، وہ حاضر حضور ہو جائے۔ نقیب کے خاموش ہوتے ہی اہل غرض بلا تکلف سامنے آجاتے اور سامنے کھڑے ہو کر نہایت صفائی سے حالات بیان کرتے، اثنائے بیان میں کسی کو کسی کے روکنے کی مجال نہ تھی، تاریخ مبارک شاہی اور ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ دونوں میں ہے کہ سلطان نے اپنے شاہی محل کے اندر چار مفتی مامور کر رکھے تھے، جب کوئی فریادی آتا تو سلطان ان مفتیوں سے مشورے کرتا، اور ان کو تنبیہ کر رکھی تھی کہ اگر کوئی معصوم ان کے فیصلہ کی بدولت تہ تیغ ہوا تو اس کا خون ناحق ان کی گردن پر ہوگا، اس لیے مفتیوں سے کوئی فروگذاشت نہ ہوتی، موجودہ دور کے ہندو مورخین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ فیروز شاہ کی حکومت عدل و انصاف کی حکومت تھی کسی شخص کو بھی دوسرے پر ظلم و تعدی کرنے کا حق نہ تھا، تمام ملک میں مکمل امن و سکون تھا، چیزوں کی فراوانی تھی، اعلیٰ و ادنیٰ ہر طبقہ کے لوگ مطمئن تھے، عام رعایا قانع اور دولت مند ہو گئی تھی،

سلاطین دہلی کی حکومت میں عدل پروری کی جو روایت قائم ہوئی، اس کو مغل بادشاہوں نے اور بھی شاندار طریقہ پر برقرار رکھا، بابر نے اپنی تزک میں خود لکھا ہے کہ اس کی فوج بھیرہ

سے گذر رہی تھی، تو اس کو معلوم ہوا کہ سپاہیوں نے بھیرہ والوں کو ستایا ہے، اور ان پر ہاتھ ڈالا ہے، تو فوراً ان سپاہیوں کو گرفتار کر کے بعض کو سزائے موت کا حکم دیا، اور بعض کی ناکیں کٹوا کر تشہیر کرایا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اکبر نے روزانہ ڈیڑھ پہر عدل و انصاف کے لیے مقرر کر رکھا تھا، جہانگیر اور بھی سخت تھا، وہ دو گھنٹے روزانہ عوام کی شکایتیں سنتا، اس نے تو اپنے محل میں ایک زنجیر لگا رکھی تھی، تاکہ ہر شخص کسی روک ٹوک کے بغیر براہ راست اس سے فریاد کر سکے، وہ سفر میں بھی ہوتا تو روزانہ تین گھنٹے بیٹھ کر فریاد سنتا اور ظالموں کو سزا دیتا تھا، علالت کے زمانہ میں بھی اس کا یہ معمول جاری رہتا، اس نے اپنی تزک میں لکھا ہے:

بہر نگہبانی خلق خدا ‏ ‏ ‏ شب نکنم دیدہ بخواب آشنا
از پئے آسودگی جملہ تن ‏ ‏ ‏ رنج پسندم بہ تن خویشتن

وہ تو نورجہاں کو بھی ایک عورت کے شوہر کو ہلاک کرنے پر موت کی سزا دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا، جیسا کہ مولانا شبلی کی نظم "عدل جہانگیری" سے ظاہر ہوگا۔

مغل بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ دیوان عام میں عوام کی شکایتیں سنتے، جہاں ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی ان کے پاس آسانی سے پہنچ سکتا تھا، جو بھی چاہتا دربار عام کے سامنے حاضر ہو کر خود اپنا استغاثہ پیش کر دیتا، دربار کے عہدیدار اس کو لے کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتے، بادشاہ اس کو پڑھوا کر سنتا، مدعی سے جرح کرتا اور پھر مناسب کارروائی کے لیے فیصلہ صادر کر دیتا، اگر مجرم کوئی بڑا عہدیدار یا شاہی خاندان کا بھی ہوتا تو اس کو سزائیں دینے میں تامل نہ کیا جاتا، شاہ جہاں نے گجرات کے ناظم حافظ محمد نصیر کو حبس دوام کی سزا اس لیے دی کہ وہاں کے تاجروں کے ساتھ وہ ظالمانہ طریقہ پر پیش آتا تھا، اسی طرح ایک بار بنگال کے ناظم فدائی خاں کو اس کے عہدہ سے برطرف محض اس لیے کر دیا کہ عوام اس کے شاکی تھے، اورنگ زیب کے ناقدین بھی اس پر یہ الزام نہیں رکھ سکتے کہ

وہ عدل پرور نہیں تھا، اس نے شاہ جہاں کو اس کی معزولی کے بعد ایک رقعہ میں لکھا کہ خداوند تعالیٰ اسی کو کچھ عطا کرتا ہے جس میں رعایا کی حالت سدھارنے اور ان کی حفاظت کی صلاحیت ہوتی ہے، حکمرانی کے معنی لوگوں کی نگہبانی ہے، نہ کہ تن پروری اور عیاشی،

اور اسی عدل پروری کا نتیجہ تھا کہ جو سلاطین مذہبی ہوتے، انھوں نے جزیہ یا نئے مندر کے بننے اور نہ بننے کا سوال تو اٹھایا، لیکن یہاں کے غیر مسلموں پر اپنا مذہب زبردستی لادنے کی کوشش نہیں کی، وہ خود تو اسلام کے محافظ اور نگہبان ضرور رہے، اور مسلمانوں کو بھی اوامر و نواہی کی پابندی کرانے کی کوشش کی لیکن کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے مذہبی عقائد میں مداخلت نہیں کی، اور ان کی معاشرتی زندگی کو درہم برہم نہیں کیا، اکبر نے انسان دوستی کے جذبہ سے ستی کے رسم کو روکنے کی کوشش کی، کمسن بیواؤں کے رواج کو بھی ختم کر دینا چاہا، بچپن کی شادی کے خلاف بھی کچھ عملی کارروائی کی، لیکن اپنی ہمدردانہ خواہشوں کو کبھی تلوار کی نوک سے عمل میں نہیں لایا، بعض فرمانرواؤں پر جبری تبلیغ کا الزام عائد کیا جاتا ہے، لیکن نئی تحقیقات سے یہ الزامات زیادہ تر بے بنیاد ثابت ہوئے ہیں، ہندو مورخین لکھتے ہیں کہ یو، پی چھ سو سال تک مسلمانوں کے زیر نگین رہا، لیکن یہاں مسلمان صرف چودہ فیصدی ہیں، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندو مذہب محفوظ رہا اور جبری اشاعت اسلام نہیں ہوئی، اور ہندوؤں کو زبوں حال نہیں بنایا گیا، تمام سلاطین اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ ان کا سیاسی مفاد اسی میں ہے کہ یہاں کے لوگوں کے مذہبی اور معاشرتی نظام میں مداخلت نہ کریں، اس رواداری کے بغیر ان کی حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی، صوفیۂ کرام نے خدمتِ خلق اللہ اور عدل پروری کی جو تعلیم دی، اور خود یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ ان کا جو کریمانہ اور روادارانہ اخلاق رہا، اس سے سلاطین کو مزید تقویت پہنچی،

سلاطین کی مدح سرائی اب تک سلاطین کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ممکن ہے کہ محض جانبدارانہ

مدح سرائی سمجھی جائے اور انگریزوں اور ان کے ہمنوا مورخوں کی تاریخ پڑھنے والوں پر یہ گراں گذرے لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جن سلاطین کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے، وہ مسلمانوں کے دورِ عروج کے اچھے حکمراں تھے، اگر ان میں واقعی یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو خون سے ہولی کھیلنے والے، ہتھیلی پر سر رکھ کر لڑنے والے، اپنے سینوں کو نوک شمشیر اور نوک سنان سے چھلنی کرنے والے راجپوتوں کی سرزمین میں ان کا اور ان کے ہم مذہبوں کا قدم جمنا آسان نہ تھا، اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کی حکومت کے دورِ عروج میں زیادہ تر اچھے حکمراں گذرے،

مملوک سلاطین میں آرام شاہ، رکن الدین فیروز شاہ، معز الدین بہرام شاہ، علاء الدین مسعود شاہ اور کیقباد جیسے بے جان حکمراں بھی گذرے، لیکن اسی خاندان میں التتمش کی نیک نفسی اور انتظامی کارکردگی، بلبن کے جاہ و جلال اور عدل گستری کی بدولت حکومت کو غیر معمولی قوت حاصل ہوئی، خلجی سلاطین کے عہد میں قطب الدین مبارک شاہ جیسا رند اور ناصر الدین خسرو جیسا مفسد حکمراں بھی ہوا، لیکن ان کے عہد کی بے عنوانیاں اور کمزوریاں ان کے پیشرو سلطان علاء الدین خلجی کی نبرد آزمائی اور رعایا پروری سے دب کر رہ گئیں، انکے خاندان کو توان سے نقصان پہنچا لیکن حکومت برقرار رہی، غیاث الدین کی مردانگی اور فرزانگی، محمد بن تغلق کی بلند حوصلگی اور اولو العزمی اور فیروز شاہ کی غیر معمولی رحمدلی اور رعیت نوازی سے جو قوت بنی اس کے سہارے ان کے کمزور جانشین کچھ عرصہ تک حکومت کرتے رہے، ابراہیم لودی کو اپنی کمزوریوں کا نتیجہ بھگتنا پڑا، ان میں سے اچھے سلاطین کی اچھائیوں کا ذکر کرنے میں جس طرح منہاج سراج (مولف طبقات ناصری) مولانا ضیاء الدین برنی (صاحبِ تاریخ فیروز شاہی) اور شمس سراج عفیف (کاتب تاریخ فیروز شاہی) نے فیاضی سے کام لیا ہے، اسی طرح موجودہ دور کے ہندو مورخین میں کے، ایس لعل نے اپنی تاریخ ہسٹری آف دی خلجیز، ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ہسٹری آف قرونہ ٹرکس، اور ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے پولٹکس ان پری مغل ٹائمس میں قابلِ قدر

سلاطین کی خوبیاں بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے،

مغل خاندان کے پہلے چھ بادشاہوں کے حربی، سیاسی، اقتصادی اور تمدنی کارنامے اتنے شاندار ہیں کہ اس خاندان کے آخری ۱۳ نااہل اور نالائق حکمراں ان ہی شاندار کارناموں کی بدولت ڈیڑھ سو برس تک تخت و تاج کے مالک بنے رہے، اور جس طرح نظام الدین بخشی نے طبقاتِ اکبری، ابوالفضل نے اکبرنامہ، معتمد خاں نے اقبال نامۂ جہانگیری، ملا عبد الحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ لکھ کر مغل بادشاہوں کے قابل قدر حکمرانوں کی مدح سرائی کی ہے، اسی طرح موجودہ دور کے ہندو مورخوں میں ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی نے رائیز آف دی موغل امپائر، ڈاکٹر بینی پرشاد نے ہسٹری آف جہانگیر اور بنارسی پرشاد نے ہسٹری آف شاہ جہاں لکھ کر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ان حکمرانوں کو خراج تحسین ادا کیا ہے، البتہ عالمگیر کی تعریف و توصیف میں جس طرح عالمگیر نامہ کے مصنف کاظم شیرازی کا قلم چلا ہے، اس طرح سر جدو ناتھ سرکار کا نہیں چل سکا ہے، لیکن اس بادشاہ کے عظیم المرتبت ہونے کی یہ دلیل کافی ہے کہ سر جدو ناتھ سرکار جیسے دیدہ ور مورخ نے اس بادشاہ کی تاریخ لکھنے میں بیس برس کی مدت گذاری اور بڑی کد و کاوش کے بعد اس کی تاریخ پانچ جلدوں میں مرتب کی، آج تک کسی "نااہل بادشاہ" کی تاریخ اتنی جلدوں میں نہیں لکھی گئی،

مغل خاندان کے پہلے چھ حکمرانوں کی تاریخ لکھنے میں مورخین کے قلم میں جو رنگینی اور توانائی پائی جاتی ہے، وہ ان کے جانشینوں کے عہد کے مورخوں میں نہیں پائی جاتی ہے، اس لیے اچھے سلاطین کا مطالعہ خواہ کتنے ہی تعصب کے ساتھ کیا جائے، اچھے ہی رہیں گے، اس لیے ان کی اچھائیوں کے ذکر میں قلم خواہ مخواہ رقص کرنے لگتا ہے،

اچھی معاشرت

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے دور عروج میں بھی سلاطین جانشینی کی لڑائیوں میں ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے، بعض شہزادے قتل کیے گئے، بعض کی آنکھوں

میں سلائیاں پھیری گئیں، بعض قید خانے میں ایڑیاں رگڑتے رہے، اسی طرح امرا میں بھی باہمی رقابت رہی، سازشوں کے ذریعہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے، ان کی وجہ سے جا بجا بغاوتیں بھی ہوتی رہیں، جن سے کبھی حکومت کی مرکزیت خطرے میں پڑ جاتی لیکن ان بدعنوانیوں کے باوجود مجموعی حیثیت سے مسلمانوں کی معاشرت کا سانچہ اور ڈھانچہ بہت زیادہ بگڑنے کے بجائے بنیادی طور پر مضبوط اور مستحکم رہا، اسی لیے اچھی معاشرت کی بدولت اچھے سلاطین پیدا ہوتے رہے، جو برے حکمرانوں کی لائی ہوئی برائیوں کا کفارہ بن جاتے،

اچھی معاشرت کے معمار صوفیۂ کرام

اور یہ حقیقت ہے کہ اچھی معاشرت اچھے صلحاء اور صوفیہ کے طفیل میں ہی بنتی رہی،

اکابر صوفیہ انابت، عبادت اور ریاضت شاقہ کے بعد تمکین و تلوین، مجاہدہ و مشاہدہ کی منزلیں طے کرکے اور عالم ملکوت و جبروت و لاہوت کی دولت سمیٹ کر کے خانقاہوں میں رشد و ہدایت کے لیے بیٹھ جاتے تو ان کی ذات تجلی ربانی و روحانی کی ایک شمع بن جاتی، اور لوگ پروانہ وار ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے، اور وہ لوگوں کے اخلاق و سیرت کو اپنے اعلیٰ کردار کے عملی نمونے سے سنوارنے کی کوشش کرتے، اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم کا مرکز علما، کا حلقۂ درس و تدریس یا ان کا مسکن نہیں رہا اور نہ سلاطین کے درباروں میں اس کے جلوے دکھائی دیے، بلکہ مسلمانوں کے اخلاق حمیدہ کی تعلیم صوفیۂ کرام کی خانقاہوں ہی میں ہوئی، اور جب یہاں کے غیر مسلم باشندے مسلمان حکمرانوں کی تلوار کو اسلام کی تلوار سمجھ کر اسلام سے آزردہ اور خوف زدہ ہو رہے تھے تو ان فقر و فاقہ والے بزرگوں کے تزکیۂ باطن اور تہذیب نفس کو دیکھ کر ان کے دلوں پر اسلام کی سچی عظمت اور شوکت قائم ہوئی،

کرامات

ان بزرگانِ دین کے حالات زندگی ایسے لکھے نہیں گئے جیسے ہونے چاہئیں، اور جو حالات ان کے معاصر تذکروں میں لکھے گئے، ان کو پڑھ کر آجکل کے کچھ لوگوں کو ان کی زندگی صرف کرامتوں میں گھری ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس میں شک نہیں کہ ان سے کرامتیں صادر ہوتی رہیں، ہندوستان کے سریع الاعتقاد لوگ سادھوؤں، رشیوں اور منیوں کے خوارق عادات سے کچھ ایسے متاثر تھے کہ ان بزرگوں کو بھی کرامتوں کے ذریعہ سے تسخیر قلوب کرنا پڑا، لیکن ان کے یہاں اظہار کرامت کوئی اہم چیز نہیں، چشتیہ سلسلہ میں راہ سلوک کے پندرہ درجے مقرر ہیں، ان میں پانچواں درجہ کشف و کرامات کا ہے، اس درجے کے حاصل ہونے کے بعد سالک کشف و کرامت کے ذریعہ سے اپنی ذات کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کے اظہار سے وہ بقیہ درجات سے محروم ہوجاتا ہے، اسی لیے حضرت بابا گنج شکر نے خواجگان چشت کے مسلک کے مطابق صوفی کو کشف و کرامت کے اظہار سے منع کیا ہے، اور فرماتے ہیں کہ اس کا اظہار کرنا پست حوصلہ والوں کا کام ہے، اس سے نفس میں تکبر پیدا ہوتا ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے بھی کرامت کے اظہار کی ممانعت سختی سے کی ہے، اور اپنے ملفوظات میں یہ بیان کیا ہے کہ ایک بار خواجہ ابو الحسن نوائی دجلہ کے کنارے پہنچے، تو دیکھا کہ ایک ماہی گیر دریا میں جال ڈال رہا ہے، خواجہ ابو الحسن نوائی نے ماہی گیر کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اگر میں صاحب ولایت و کرامت ہوں گا تو تمھارے جال میں میرے کہنے سے ڈھائی من وزن کی ایک مچھلی پھنسے گی اور مچھلی ٹھیک اسی وزن کی ہوگی، نہ کم نہ زیادہ، ان کے کہنے کے مطابق واقعی اس وزن کی مچھلی پھنس گئی، اس کی خبر شیخ جنید قدس سرہ کو ہوئی تو انھوں نے فرمایا، کاش اس جال میں ایک مار سیاہ پھنستا اور ابو الحسن کو کاٹ لیتا کہ وہ ہلاک ہوجاتے، لوگوں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں فرماتے ہیں، جواب دیا کہ اگر سانپ ان کو کاٹ لیتا تو وہ شہید ہوجاتے، لیکن

اپنی کرامت کے بعد زندہ رہے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ ان کا خاتمہ کس طرح ہوا،

اصلی کرامت

ان بزرگانِ دین کی اصلی کرامت ان کی نفس کشی تھی، ان کا قول تھا کہ دریا کی سطح پر چلنا، آگ میں کود کر زندہ نکل آنا، پہاڑ کو ناخن سے کھود کھود کر گرادینا آسان ہے لیکن نفس کو قابو میں رکھنا آسان نہیں، اسی لیے وہ نفس کشی کے لیے ہر قسم کا مجاہدہ کرتے، حضرت خواجہ معین الدینؒ رات کو کم سوتے اور بالعموم عشاء کے وضوء سے فجر کی نماز ادا کرتے، عبرت حاصل کرنے کے لیے قبرستان میں قیام فرماتے، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بیس برس تک رات کو اطمینان سے نہ سوئے اور نہ زمین سے پیٹھ لگائی، حضرت بابا گنج شکرؒ عالم تفکر میں ایک عرصۂ دراز تک کھڑے رہے مطلق نہ بیٹھے، ان کے پاؤں سوج گئے تھے، اور ان سے خون بہتا تھا، اس درمیان میں ان کو یاد نہیں کہ انھوں نے کچھ کھایا ہو، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ صائم الدہر رہے، صرف افطار اور سحری کے وقت آدھی یا زیادہ سے زیادہ ایک روٹی سبزی یا تلخ کریلہ کے ساتھ کھاتے، لیکن کبھی کسی لقمہ میں لذت محسوس ہوتی تو اس کو منہ سے نکال کر دسترخوان پر ڈال دیتے، تاکہ کام و دہن لذت آشنا نہ ہونے پائیں، اسی لیے ان کے دسترخوان سے ادھ چبے نوالے بھی پائے جاتے، وہ تمام رات عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے، اور ان پر غیر معمولی کیف و مستی اور بیخودی و وارفتگی طاری رہتی، صبح ہوتی تو شغل باطن سے آنکھیں سرخ رہتیں، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ اپنی ابتدائی ریاضت کے زمانے میں کھانے پینے سے پرہیز کرتے، جب کبھی ان پر اشتہا کا غلبہ ہوتا تو درخت کی پتیاں کھا کر بھوک کی شدت رفع کرلیتے، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ اپنے مجاہدے میں دس دس روز تک کچھ نہ کھاتے، اور جب خواہشات کا غلبہ ہوتا تو لیموں کا عرق پی لیتے،

ان بزرگوں کے یہاں فقر و فاقہ کی بڑی اہمیت تھی، ان کا خیال تھا کہ فقر و فاقہ سے نفس

میں فتادگی اور دل میں عاجزی پیدا ہوتی ہے، اگرچہ بھوک سے جسم بلا میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن دل کو روشنی اور جان کو صفائی حاصل ہوتی ہے، کھانے سے گناہوں کا مادہ بڑھتا ہے، اور فاقہ سے سب اطاعتوں کی اصل ملتی ہے، اور سب سے بڑھ کر اسی سے نفس کشی ہوتی ہے،

اس نفس کشی کے ذریعہ سے صوفیہ کوشش کرتے کہ ان میں حضرت آدمؑ کی توبہ، حضرت ادریسؑ کی عبادت، حضرت عیسیٰؑ کا زہد، حضرت ایوبؑ کی رضا، حضرت یعقوبؑ کی قناعت، حضرت یونسؑ کا مجاہدہ، حضرت یوسفؑ کا صدق، حضرت شعیبؑ کا تفکر، حضرت نوحؑ کا اخلاص، حضرت ابراہیمؑ کا شکر، اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا ہو جائے،

اور جب ان کو یہ چیزیں حاصل ہو جاتیں تو وہ رشد و ہدایت کی مسند پر جلوہ افروز ہوتے، اور ایک طرف سلاطین کا تخت و تاج ہوتا تو دوسری طرف ان کی فقیری کے جلوہ ہائے صد رنگ ہوتے، بادشاہوں کے درباروں میں جاہ حشمت، دولت، ثروت اور رتبہ ملتا، لیکن ان فقیروں کے درباروں میں توحید، ایمان، طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تواضع، اخلاص، قناعت، صدق و صفا، محبت رسول، خدمت خلق اللہ، حلم و عفو، حقوق ہمسایہ، محبت و مودت وغیرہ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ملتی رہی،

سلاطین اور صوفیہ کی زندگی کا تفاوت

دونوں اپنے اپنے حلقے کے حکمراں تھے، لیکن ان دنیاوی اور روحانی حکمرانوں کی زندگی میں بڑا تفاوت تھا، سلاطین کے لباس و پوشاک میں بڑی نمائش ہوتی، ان کے تاج، قبا اور پٹکے میں موتی اس طرح آویزاں ہوتے کہ پٹکے کی چمک کمر تک، قبا کی گلے تک اور تاج کی سر تک ہوتی، ان کی بعض پوشاک میں جوڑے جوڑے زردوزی کا کام ہوتا، گلے پر جو کام کیا جاتا وہ جواہرات سے سجایا جاتا اور اس میں یاقوت اور ہیرے ٹانکے جاتے، اور بعض لباس میں اس قدر جواہرات ٹکے ہوتے تھے کہ کپڑے کا رنگ نظر نہیں آتا تھا،

سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار میں منقش فرش بچھایا جاتا، زربفت کے پردے لٹکائے جاتے، چاندی اور سونے کے برتن رکھے جاتے، جن میں میوے، شربت اور پان رکھ کر اہل مجلس کی تواضع کی جاتی تھی، سلطان معز الدین کیقباد نے ایک سال جشن نوروز منایا تو اس موقع پر زربفت، اطلس، یاقوت، زری کے کام اور دوسرے قیمتی کپڑوں کی نمائش سے دربار کو جنت بنا دیا، جمنا کے بیچ میں زر و جواہر سے ایک مصنوعی چمن بنایا گیا تھا، محل کے در و دیوار اور فرش و فروش سونے اور موتیوں سے ایسے آراستہ کیے گئے تھے کہ فردوس بریں کا دھوکا ہوتا تھا، مسالک الابصار کے مصنف کا بیان ہے کہ جو شان و شوکت، جاہ و جلال اور کر و فر سکندر ذوالقرنین اور ملک شاہ بن الپ ارسلان کے دربار میں تھا، وہی محمد بن تغلق کے دربار میں نظر آتا تھا،

لیکن ان بادشاہوں کے اسی دار السلطنت میں اکابر صوفیہ کی خانقاہوں میں بوریا کے سوا کچھ نہ تھا، ان کے کپڑے پھٹ جاتے تو پیوند لگا دیتے، بعض اوقات ناداری کی وجہ سے پیوند بھی نہیں لگا سکتے تھے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے فقیرانہ لباس میں دوہرا جبہ ہوتا تھا، اگر وہ پھٹ جاتا تو جس رنگ کا کپڑا مل جاتا اسی کا پیوند لگا لیا کرتے تھے، اسی پر ان کے سلسلہ کے تمام بزرگوں کا عمل رہا، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے کپڑے پھٹ جاتے تو بھی علیحدہ نہ کرتے تھے، ایک بار کرتہ بہت ہی بوسیدہ ہو گیا تھا، ایک شخص نے نیا کرتہ نذر کیا، کرتہ پہن تو لیا، لیکن فرمایا جو ذوق مجھکو اس پرانے کرتہ میں حاصل تھا، اس نئے کرتہ میں نہیں ہے، جس کمبل پر دن کو بیٹھتے، اسی کو رات کے وقت اپنا بستر استراحت بناتے، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے ملفوظات میں ہے کہ کوئی دنیادار ان سے ملنے آتا تو وہ شیخ کا جبہ پہنکر بیٹھ جاتے، اور جب وہ چلا جاتا تو گھاروے کا لباس پہن لیتے، شیخ کا جبہ پہنکر لوگوں سے اپنے فقر کو پوشیدہ رکھتے تھے،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مشہور خلیفہ حضرت برہان الدین غریبؒ بڑے نحیف و منحنی تھے، مرشد سے تعلیم و تربیت پانے کے زمانے میں ایک بار انکے دونوں زانوؤں میں درد رہنے لگا تھا، اسلئے کمبل کو دو تہ کرکے اس پر بیٹھتے تھے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کو اس کی خبر ہوئی تو ان کی یہ تن آسانی ان کو پسند نہ آئی، اور جب حضرت برہان الدین غریبؒ حضرت خواجہ کی خانقاہ میں آکر جماعت خانہ میں آئے تو حضرت خواجہ نے کہلا بھیجا کہ وہ جماعت خانہ میں نہ بیٹھیں، حضرت برہان الدین غریبؒ گھر جاکر سوگ میں بیٹھ گئے، اور برابر روتے رہتے، ان کی تعزیت کے لیے لوگ آتے تو ان کے ساتھ وہ بھی روتے، بالآخر حضرت امیر خسرو بیچ میں پڑے، اور وہ حضرت برہان الدین غریبؒ کو ان کی دستار ان کی گردن میں ڈال کر حضرت خواجہ کے پاس لے گئے تو انھوں نے تقصیر معاف کی اور تجدید بیعت سے مشرف کیا،

اس زمانہ میں محل میں کوئی دعوت ہوتی تو دسترخوان پر ایک ہزار سے زیادہ قسموں کے کھانے ہوتے، شربت قند کے سینکڑوں پیالے رکھے رہتے، منہ کا مزہ بدلنے کے لیے شربت گلاب بھی ہوتا، انواع واقسام کے حلوے ہوتے، روٹیوں میں نان تنک، کاک اور سنبوسے وغیرہ کی کئی قسمیں ہوتیں، پلاؤ کے بھی کئی اقسام ہوتے، کسی میں گوشت، کسی میں خرمہ اور کسی میں انگور پڑا ہوتا، بکرے، دنبے، بٹیر، تیتر، تیہو اور چرز کے قورمے اور کباب ہوتے، کھانے کے بعد نبیذ کا بھی دور چلتا، لیکن معاصر اکابر صوفیہ کے گھروں اور خانقاہوں میں ان مادی آلائشوں کے بجائے فقروفاقہ، تنگی، عسرت اور ناداری کے سوا کچھ نہ ہوتا، سلطان شمس الدین التمش کے مرشد حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے گھر میں برابر فاقہ رہتا، جب کئی فاقوں کی نوبت آجاتی تو انکی حرم محترم پڑوس کے بقال کی بیوی سے ایک تنکہ یا ایک بہلول قرض لیکر خورد و نوش کا انتظام کرتیں، جب کہیں سے کچھ میسر ہوتا تھا تو قرض ادا کر دیا جاتا تھا،

(باقی)

شاہ محمد غوث گوالیاریؒ

از جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب ایم اے

(۲)

قیام گوالیار شاہ محمد غوث گوالیاری نے اپنے شیخ طریقت حاجی حمید الدین حضور (متوفی ۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء) سے مستقل قیام کے لیے استفسار کیا تو موصوف نے فرمایا: "کل جہاں تمھارا ہے، جہاں مزاج چاہے رہو، اس میں تم کو اختیار دیا گیا ہے"۔[1]

سید فضل علی شاہ نے کلیات گوالیار میں لکھا ہے:-

"درآں وقت حضرت شیخ محمد غوث قدس اللہ سرہ العزیز کہ از اکابر و عظام روزگار بودند در قلعہ بر قلوب تصرفے تمام داشت و از غازی پور پٹنہ کہ متوطن و مسکن حضرت شیخ مذکور بود بمقتضائے حکم مرشد حضرت با صفا حضور شاہ ظہور الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز مفارقت گرفتند و بہ گوالیار رسیدند"۔[2]

لیکن جواہر خمسہ (۹۲۹ھ) کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوہستان چنار میں زمانۂ ریاضت ہی میں قلعۂ گوالیار میں قیام کا اشارہ ہوگیا تھا، چنانچہ شاہ محمد غوث تحریر فرماتے ہیں:

"این درویش سیزدہ سال و ہفت ماہ در کوہستان چنار بعنوان سطور ریاضت کشید

[1] فضل اللہ شطاری: مناقب غوثیہ (اردو) مطبوعہ آگرہ، ۱۹۳۳ء ص ۳۲

[2] قاضی معراج الدین وصولپوری: مضمون مطبوعہ، روزنامہ نوروز، کراچی، ۱۴ دسمبر ۱۹۶۱ء ص ۲

بعد ذالک از پردۂ غیب لاریب ندائے رسید کہ ازیں کوہستان بدر شو و در قلعۂ گوالیار برو....... آں حکم بجا آوردیم۔"[1]

قلعۂ گوالیار میں قیام کے یہ تو باطنی اسباب تھے، لیکن چند ظاہری اسباب بھی تھے، جن پر قاضی معراج الدین دھولپوری نے روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ممدوح کے قلعۂ گوالیار پر قیام فرمانے کا سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں سادات اور شرفا کے قدیم خاندان قلعہ پر ہی رہا کرتے تھے، باہر جس جگہ اب گوالیار کی بستی ہے وہاں مسلمانوں کی آبادی نہیں تھی، نیا نیا ان کا قبضہ قلعۂ گوالیار پر ہوا تھا، اور جیسے جیسے اقتدار بڑھتا جارہا تھا ویسے ویسے مسلمان فضلا، وکملا، اور روحانی بزرگ باہر سے آکر یہاں آباد ہوتے جارہے تھے، یہ وہ وقت تھا جب حضرت شاہ محمد غوث قدس سرہٗ کو نہ کوئی جاگیر ملی تھی اور نہ آپ کی جانب سے انتظام نہانداری کوئی تھا۔"[2]

بہرحال شاہ محمد غوث گوالیار تشریف لائے اور یہاں رشد وہدایت کا سلسلہ جاری کیا، صاحب مناقب غوثیہ لکھتے ہیں:

"الغرض جب حضرت غوث اللہ، حضرت پیر جہاں (حاجی حمید الدین حضور) کی درگاہ سے رخصت ہوکر گوالیر پہنچے اور وہاں اقامت کی تو بانگ درویشی وصدائے عظمت ولایت موروثی عالم میں پھیلی، عالم و عالمیاں، ملوک وسلاطین وقت مطیع ومنقاد ہوئے، مگر آپ کا یہ حال تھا کہ کوئی شخص مجلس عالی میں دنیا کا نام نہ لے سکتا تھا۔"[3]

گوالیار میں کچھ عرصہ قیام کیا تھا کہ مرض خیارک میں مبتلا ہوگئے، اور چھ مہینہ تک صاحب فراش

[1] محمد غوث گوالیاری: جواہر خمسہ فارسی (قلمی)، ۷ر صفر المظفر ۱۱۷۳ھ، مکتوبہ محمد دائم بیگ قادری ص ۴۴۔

[2] قاضی معراج الدین دھولپوری، مضمون مطبوعہ روزنامہ "نور روز" کراچی ۲۸ دسمبر ۱۹۶۱ء [3] مناقب غوثیہ (اردو)

رہے، جب اس مرض سے صحت پائی تو قاضی رکن الدین اور قاضی خدا بخش کی وساطت سے اپنے شیخ طریقت حضرت حاجی حمید الدین حضور کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر یہ حضرات پیام لے کر چلے اور ادھر حاجی حمید الدین نے شیخ سکندر سے فرمایا:

"آج مجھ کو اطلاع ہوئی ہے کہ اس عالم دون سفلی سے عالم عقبیٰ میں آؤں اور دار فنا سے دار بقا کا سفر اختیار کروں، میں نے جواب دیا کہ چار روز کے بعد آؤں گا، کیونکہ بندگی میاں غوث کے آدمی راستے میں ہیں، جب وہ آجائیں گے تو صاحب مقام کو دستار عطا کرکے اس عالم سے اس عالم میں آؤں گا۔" (مناقب غوثیہ (اردو) ص ۵۰)

اس لیے جب قاضی رکن الدین اور قاضی خدا بخش، حاجی حمید الدین حضور کی خدمت میں پہنچے تو آپ بہت مسرور ہوئے اور اسی وقت جبہ ودستار طلب کرکے اپنے دست مبارک سے دونوں حضرات کے سپرد کیا، اور اپنی جانب سے شاہ محمد غوث (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) کے نام ایک فرمان لکھوا کر دستخط فرماکر قاضی رکن الدین کے حوالے کیا، صاحب مناقب غوثیہ نے فرمان مذکور کا یہ مضمون لکھا ہے:

"صحیح فی الدنیا والآخرہ بندگی حضرت شیخ المشائخ میاں محمد غوث متع اللہ المسلمین بطول بقائہ از ظہور شمس النصاری المقدسی مطالعہ فرمایند تمام احوال قابل شکر ہے قل الحمد للہ دائماً معلوم و روشن ہوکہ اس درویش کو بھی بیس رمضان سے دان کا دورہ ہوا تھا، اور جو کچھ حال واحوال اور اقوال اس فقیر کا ظاہر وباطن تھا آں فرزند کو سونپ کر اپنا قائم مقام کیا، بلکہ قالب کا حکم بھی تم شیخ المشائخ کے ہاتھ میں دیا، چنانچہ اپنی موجودگی میں صندوق طیار کراکر حاضران مجلس کو (دکھا رہے) آدمیوں کی موجودگی میں نصیحت کردی ہے کہ ہم کو امانت رکھو، قالب کا اختیار بھی فرزندم میاں محمد غوث کو دیا

جس جگہ وہ قابل سمجھیں بیجائیں، دوسرے یہ کہ آں فرزند کو اپنا قائم مقام کرکے جملہ خلفاء و مریدین کو حوالہ کیا جس کو آں فرزند مقبول کرے، مقبول ــــ اور جس کو مردود کرے، مردود اور جبہ و دستار اپنے حضور تمہارے آدمیوں کے سپرد کر دیا یقین کرلو کہ جو کچھ رنج و مشقت اس فقیر نے اٹھایا اور درگاہ حق میں توکل پر ثابت رہا وہ سب آں فرزند کے واسطے تھا ــــ یہ فقیر درخت کے سایہ میں مرقد کرے گا انشاء اللہ تعالیٰ اور جو اس فقیر کے سفر کے بعد ہوگا وہ شیخ سکندر کی کتابت سے معلوم ہوگا۔" (مناقب غوثیہ اردو ص ۵۳-۵۴)

حاجی حمید الدین حضور کی وفات کے بعد شیخ سکندر نے جو مکتوب شاہ محمد غوث کے نام ارسال کیا تھا اور اس میں جو چشم دید واقعات بیان کیے تھے اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ حاجی حمید الدین نے اپنی وفات کے بارہ میں جو کچھ فرمایا تھا حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا ــــ مکتوب مذکور کے آخر میں شیخ سکندر تحریر فرماتے ہیں:

"اکیس ذی الحجہ کو ایک پاس شب باقی تھی کہ یکایک فرمایا" یارو اٹھو، رحمت کا وقت ہے، اس درویش کو پھر حکم ہوا ہے کہ آج جو تھا روز ہے کہ تمام انبیاء و اولیاء تمہاری ملاقات کے منتظر ہیں، شتاب آؤ" ــــ اور اس وقت چوڈول پر سوار ہو کر باہر آئے اور اپنے حضور میں قبر درست کرائی، بعدہٗ اس چوڈول کو درخت کے سایہ کے نیچے لائے جو کوئی اپنا حال عرض کرتا فرماتے "فرزندم میاں محمد غوث کے حوالہ کیا، یہاں تک کہ صبح صادق چمکی اور آپ سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر شغل مع اللہ کے ساتھ دار الفنا سے دار البقاء کو رحلت فرما گئے،

دیگر معروض کہ اس خاک روب آستانہ کو خاک روبی آستانہ کی خدمت پر نوازکر جامۂ خلافت عطا فرمایا ہے لیکن ثابت جب ہی ہو سکے گا جب آنحضرت قبول فرمائیں گے۔"
(ایضاً ص - ۵۵)

غرض حضرت حاجی حمید الدین حضور کی وفات کے بعد شاہ محمد غوث گوالیاری مسند خلافت پر متمکن ہوئے، اور گوالیار میں قیام کرکے دور و نزدیک فیض رسانی کا سلسلہ شروع ہوا۔

شاہ محمد غوث گوالیاری کے زمانے میں گوالیار میں ایک اور بزرگ بھی قیام پذیر تھے، جن کو خواجہ خانوں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، بعض تذکرہ نگاروں نے شیخ خانو بھی لکھا ہے، خواجہ خانوں اور شاہ محمد غوث کے درمیان غائبانہ ربط باطنی تھا، اس لیے ان کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالتے چلیں، اور ساتھ ہی ان بے بنیاد باتوں کی تصحیح بھی کر دی جائے جو ان دونوں حضرات کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں،

خواجہ خانوں اور شاہ محمد غوث | شاہ محمد غوث کے زمانے میں خواجہ خوانوں (متوفی ۹۴۰ھ / ۱۵۳۳ء) بھی گوالیار میں تشریف رکھتے تھے، موصوف کی ولادت ۸۵۳ھ میں ہوئی، ناگور کے رہنے والے تھے، وہاں سے ترک وطن کرکے گوالیار تشریف لے آئے تھے[1]، خواجہ حسین ناگوری سے بیعت تھے، اور شیخ حسین سرمست کے فرزند شیخ اسماعیل سے خرقۂ خلافت ملا تھا، جو چندیری میں رہا کرتے تھے،[2]

خواجہ خانوں کی درگاہ کے موجودہ سجادہ نشین کا یہ خیال ہے کہ جب خواجہ خانوں گوالیار تشریف لائے تو اس وقت شاہ محمد غوث گوالیار میں سلسلۂ رشد و ہدایت میں مصروف تھے، موصوف نے ایک عجیب و غریب حکایت نقل کی جس کی اصلاح ضروری ہے، اپنی تالیف فیضان ولایت میں لکھتے ہیں:

"جب آپ (خواجہ خانوں) گوالیار میں تشریف لائے تو اس وقت حضرت محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ہر نو وارد و مسافرین یوم مہمان رہا کرتا تھا، مگر آپ ان کے دسترخوان پر

---

[1] محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) مطبوعہ ۱۳۲۶ھ ص ۲۳۳

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی: اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ،

نہ پہنچے، محمد غوثؒ نے آپ کی خدمت میں اپنے خادم کو بلانے کے لیے بھیجا، آپ غسل فرما کر بحالتِ سکون ایک پتھر پر بیٹھے تھے، خادم کے عرض کرنے پر آپ نے جواباً فرمایا کہ فقیر آمد و رفت کے لیے نہیں ہے اور نہ یہ فقیر کے مناسب حال ہے، پس اسے معذور رکھو، محمد غوثؒ کو اس تعارض سے ناگواری ہوئی اور اپنے خدامِ "اجنہ" کو حکم دیا کہ جس پتھر پر وہ بیٹھے ہیں مع اس پتھر کے ان کو اٹھا لاؤ، چار "جن" تعمیل حکم کے لیے آئے لیکن وہ پتھر نہ اٹھا سکے، اور لاچار ہو گئے، حضرت خواجہ خانوں نے ان "اجناء" سے کہا کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو جنوں نے ادب سے عرض کیا کہ ہم تو تابعدار ہیں جو حکم دیا گیا تھا تعمیل کر رہے تھے، اب جو حکم دیا جائے گا اس کی تعمیل کریں گے، حضرت خواجہ نے متبسم ہو کر فرمایا "جاؤ غوث کو مع اس تخت کے اٹھا لاؤ جس پر وہ بیٹھے ہوئے ہیں"۔۔۔ جن گئے اور آنِ واحد میں حضرت محمد غوث کو مع تخت کے حضرت خواجہ کے سامنے لا کر رکھ دیا، حضرت محمد غوث بہت حیران ہوئے اور سلام شوق کے بعد اس طرح معذرت کی:

"اے شیخ محترم مجھے قطعی علم نہ تھا کہ آپ شاہ ولایت ہیں، ورنہ مجھ سے ہرگز یہ عمل نہ ہوتا"

حضرت خواجہ نے مسکرا کر کہا، کوئی حرج نہیں، دوستوں کی ملاقات چھیڑ چھاڑ سے ہی ہوا کرتی ہے، حضرت محمد غوث کے تخت پر بہت سے اسبابِ عملیات؛ نجورات وغیرہ رکھے تھے، اور ایک بیاض بھی رکھی تھی، جسے حضرت خواجہ نے اٹھا کر دریافت کیا "محمد غوث یہ کیا ہے؟" حضرت غوث کی زبان کی لغزش سے اتفاقاً نکل گیا "حضور، کچھ نہیں"۔۔۔ پس حضرت خواجہ نے بیاض یہ کہتے ہوئے رکھ دی "اچھا کچھ نہیں"۔۔۔ تھوڑے وقفہ کے بعد کسی ضرورت سے محمد غوث نے اس بیاض کو کھولا تو اس کے سب اوراق سفید تھے، بہت سراسیمہ ہوئے اور حضرت خواجہ کی جانب رحم طلب نظروں سے دیکھا، حضرت خواجہ علیہ الرحمہ نے

مسکرا کر فرمایا، محمد غوث اس میں کچھ نہیں، تجھ میں سب کچھ ہے، تین مرتبہ زبان فیض ترجمان سے اس جملہ کا ادا ہونا ہی تھا کہ حضرت غوث رحمۃ اللہ علیہ کامل ہو گئے، نجورات وغیرہ سب اٹھا کر پھینک دیں اور غلبۂ ترک سے مغلوب ہو کر نظارۂ جمال وحدت میں مستغرق ہو گئے، کیف و سرور اور معراج معرفت یاب حضرت غوث رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت خواجہ خانوںؒ سے وقت رخصت گاہ بگاہ حاضر ہوتے رہنے کی اجازت چاہی، مگر حضرت خواجہؒ نے فرما دیا اور کہا کہ ایک کام وقت پر موقوف ہے، اس کی ادائیگی تم کرو گے، اسی وقت ملاقات ہوگی۔"[۱]

اس حکایت میں جتنی صداقت ہے وہ خود اس کے انداز بیان سے ظاہر ہے، صاحب فیضان ولایت کے قول کی روشنی ہی میں اس واقعہ کی تردید ہو جاتی ہے، موصوف نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ خانوں تقریباً ۹۰۰ھ میں گوالیار تشریف لائے تھے[۲]، اور شاہ محمد غوثؒ کوہ چنار کی ریاضت کے بعد گوالیار تشریف لائے، جواہر خمسہ ایام ریاضت کی تصنیف ہے اور اس کا سنہ تصنیف ۹۲۹ھ ہے، اس سے ظاہر ہے کہ شاہ محمد غوث، خواجہ خانوں کے تقریباً ۲۹ برس بعد گوالیار تشریف لائے۔۔۔ حکایت مذکور کی بنیاد اسی پر قائم تھی کہ خواجہ خانوںؒ بعد میں تشریف لائے، جب بنیاد ہی قائم نہ رہی تو حکایت کی صحت و عدم صحت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے، یہ بھی واضح رہے کہ شاہ محمد غوث کی ولادت ۹۰۷ھ میں ہوئی تھی، یعنی جس وقت خواجہ خانوںؒ گوالیار تشریف لائے ہیں اس وقت شاہ محمد غوث پیدا ابھی نہیں ہوئے تھے،

صاحب فیضان ولایت کی ایک تحریر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ خانوںؒ اور شاہ محمد غوثؒ زندگی میں نہیں مل سکے، موصوف نے لکھا ہے:

---

[۱] نظام محی الدین: فیضانِ ولایت، مطبوعہ علوی پریس، گوالیار، ص ۱۴-۱۵ [۲] ایضاً ص ۱۸

"۔۔۔ ۹۴۰ھ میں مورخہ یکم جمادی الاول کو آپ نے اپنے بڑے فرزند حضرت خواجہ بندگی احمد قدس اللہ سرہم سے ارشاد فرمایا کہ میں اب تم سب سے رخصت ہوتا ہوں، بعد وفات میری تجہیز و تکفین حضرت محمد غوث گوالیاری کریں گے، میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ملاقات ان کی ہماری اس وقت پر منحصر ہے۔"[1]

آخری جملے سے صاف ظاہر ہے کہ زندگی میں دونوں بزرگوں کی ملاقات نہیں ہوئی، اور مذکورہ بالا قصہ محض گڑھا ہوا ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ خانونؒ کے فرزند اکبر حضرت خواجہ بندگی احمد (متوفی ابعد ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء) نے جو واقعہ بیان کیا ہے، صاحب فیضان ولایت نے اسی میں مبالغے سے کام لے کر رائی کا پہاڑ بنایا ہے، اصل واقعہ یہ ہے جو بڑی حد تک مستند سمجھا جاسکتا ہے:۔

"ایک روز حضرت قبلہ گاہی طہارت فرما رہے تھے، اور کچھ افاقہ بھی تھا، اچانک شیخ محمد غوث کے ہاں سے دو خادم آئے، سلام پیش کیا، حضرت نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ کہاں سے اور کس لیے آئے ہو؟ مقیم ہو یا مسافر؟ انھوں نے کہا کہ ہم تو شیخ محمد غوث کے خادموں میں سے ہیں، شیخ نے پیام دے کر آپ کے پاس بھیجا ہے اور دعائے شوق کے بعد کہا ہے کہ آپ کے دیدار کا بیحد اشتیاق ہے، اور باہمی ملاقات کا شوق مرتبۂ کمال پر پہنچا ہوا ہے، اگر غریب خانے پر تشریف لے آئیں تو آپ کا گھر ہے، ورنہ مجھے اجازت مرحمت فرمائیں کہ حاضر ہو کر دیدار سے مشرف ہوں اور وصال باہمی سے لطف اندوز ہوں، حضرت قبلہ گاہی کو علم اولین و آخرین تھا، ان دونوں کی باتیں سنکر مسکرائے اور جواباً فرمایا کہ فقیر خانوں کو ان دونوں باتوں سے معذور رکھیے، کیونکہ یہ فقیر کہیں جانے کے لیے مامور نہیں، اور کسی کے لیے تعظیماً قیام سے بھی معذور ہے، شفقت و دوستی کا یہی تقاضا ہے کہ فقیر کو ان دونوں تکالیف سے معذور رکھیں، ہماری ملاقات ایک وقت پر موقوف ہے، اس وقت کے منتظر ہیں، انشاء اللہ تعالیٰ اگر ہونی ہے تو ضرور ہوگی۔"[1]

فیضان ولایت کا جو اقتباس پہلے نقل کیا جاچکا ہے اس کا اول و آخر اسی مذکورۂ بالا اقتباس سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، باقی جو کچھ ہے وہ اختراعِ ذہنی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا،

خواجہ خانونؒ کے فرزند اکبر خواجہ احمد نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کے بیان کی روشنی میں بھی صحیح معلوم ہوتا ہے، حضرت شیخؒ فرماتے ہیں:

"از جہت کبر سن و ضعف بنیہ بہ تعظیم مردم قیام نمودے، خدمت والا صحبت شریفش رسیدہ بودند از ترک تعظیم و قیام کہ از وے در مردم شہرت یافتہ بود پرسیدہ، فرمود کہ من پیر شدہ ام و ضعیف گشتہ از برائے تعظیم ہر داخل خارج قیام نتوانم کرد، مخصوص ساختن بعضے دون بعضے لایق بہ حال فقراء نباشد، مرا معذور دارید۔"[2]

بہرکیف یہ بات متحقق ہے کہ خواجہ خانونؒ اور شاہ محمد غوث بیک وقت گوالیار میں موجود تھے، مگر ان کی ملاقات نہیں ہوئی، چنانچہ خواجہ خانونؒ کے خلیفہ نے کلیات گوالیار میں لکھا ہے:۔

"باوصفیکہ ہر دو شیخ در یک عصر بودند لیکن ہر دو صاحبان را ملاقات نشد۔"[3]

خواجہ خانونؒ کے وصال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق شاہ محمد غوث گوالیاری تشریف لائے اور خواجہ مرحوم کے صاحبزادگان کے ساتھ غسل دیا، تجہیز و تکفین فرمائی، اس کے بعد نماز جنازہ بھی آپ ہی نے پڑھائی، ۹۴۰ھ دوم جمادی الاول وقت چاشت تدفین سے فارغ ہوئے،[4]

---

[1] فیضان ولایت ص ۱۸

---

[1] سید فضل علی شاہ، کلیات گوالیار، بحوالہ مضمون قاضی معراج صاحب دھولپوری مطبوعہ نوروز کراچی دسمبر ۱۹۶۱ء

[2] شیخ عبد الحق محدث دہلوی: اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ ص ۲۲۳ [3] سید فضل علی شاہ: کلیات گوالیار،

[4] غلام محی الدین: فیضان ولایت ص ۱۸

مغربی پاکستان کے مشہور اردو اخبار جنگ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۰ء ص ۸، کالم ۲ و ۳ پر ایک مضمون "فیض خانوں" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس کو ایک مجہول الاسم شخص "ع، ع، خانوی" نے لکھا تھا، اس مضمون کے تمام مندرجات فیضان ولایت کا سرقہ ہیں، اور مضمون نگار نے اپنی طرف سے تحریف و ترمیم سے بھی کام لیا ہے، اس کو دیکھکر بیساختہ زبان سے نکلتا ہے ع

چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد!

شاہان ہند سے تعلقات فقراء کے دربار ہمیشہ سے شاہان عالم کے ملجا و ماویٰ رہے ہیں، چنانچہ شیخ محمد غوثؒ کے دربار سے بھی شاہوں کی وابستگی رہی، صاحب مناقب غوثیہ (۹۴۹ھ) شاہ فضل اللہ نے تحریر فرمایا ہے:-

"حضرت غوث العالم کی باطنی استقامت اور قلبی استعانت عالم میں مشہور و معروف ہے، تصرف کرنا انکے ہاتھ میں ہے، اگر گدا کو چاہیں تو تخت پر بٹھائیں اور شاہ کو گدا بنائیں، چنانچہ سلطان ابراہیم افغان اور بابر بادشاہ و ہمایوں بادشاہ کے قصے عالم صورت مشہور ہیں، اسی طرح سلطان صوفی سے باطنی نعمت لے کر شیخ مبارک مجذوب عامی کو دنیا عالم معنی میں اظہر من الشمس ہیں۔"[1]

تاتار خاں والی گوالیار کو جب اطراف کے زمینداروں نے پریشان کرنا شروع کیا اور اسکو ان شرپسندوں کے حملہ کا خطرہ پیدا ہوا تو اس نے بابر بادشاہ سے کمک مانگی، اس نے کمک بھیجی، اس زمانہ میں شاہ محمد غوث گوالیاریؒ بھی قلعہ میں تشریف فرما تھے، ایک اطلاع کے مطابق بابر بادشاہ نے حاضر خدمت ہو کر شرف قدم بوسی حاصل کیا تھا۔

تاریخ فرشتہ نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے[2]، جس کو محمد حسین آزاد نے دربار اکبری میں نقل کیا ہے۔

---

[1] مناقب غوثیہ (اردو) ص ۴۰۔ [2] محمد قاسم ہندو شاہ استرآبادی معروف بہ فرشتہ = تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۸۵، مطبوعہ بمبئی ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۲ء،

وہ لکھتے ہیں:-

"خاص و عام ہندوستان کے شیخ (محمد غوثؒ) کے ساتھ دلی ارادت اور اعتقاد رکھتے تھے، اور ایک وقت ایسا ہوتا تھا کہ خود بادشاہوں کو اپنے دنیا کے کاموں میں بھی ان کی طرف رجوع کرنی پڑتی تھی، گجرات، بنگالہ اور دہلی میں نامی مشائخ ان کے دامن وسیع کو پکڑے رہے، جبکہ بابر بادشاہ آگرہ تک پہنچکر ملک گیری کر رہے تھے، اس وقت تاتار خاں والی گوالیار کو اپنی اطراف کے بعض سرداروں کی طرف سے خطرہ معلوم ہوا، اس نے بابر کو عرضی بھیجکر اطاعت ظاہر کی، بابر نے خواجہ رحیم داد اور شیخ گھورن کو فوج دے کر بھیجا کہ قلعہ پر قبضہ کرلیں، جب یہ فوج لیکر پہنچے تو تاتار خاں اپنے قول سے پھر گیا،...... شیخ محمد غوث ان دنوں قلعے میں رہتے تھے، انھوں نے ایک با اقبال بادشاہ کی آمد آمد دیکھکر اندر سے تدبیر بتائی، اس کے بموجب انھوں نے تاتار خاں کو کہلا بھیجا کہ ہم جو یہاں آئے تو فقط اس لیے کہ تمھیں تمھارے دشمنوں سے بچائیں اور آئے تو تمھارے بلانے سے آئے، اب کف دست میدان میں پڑے ہیں ...... اتنی اجازت دو کہ ہم چند خدمت گاروں کے ساتھ رات کو قلعہ میں آجائیں، لشکر باہر رہے گا.. تاتار خاں ..... نے اجازت دیدی ..... سرداران مذکور نے راتوں رات اپنے بہت سے آدمی قلعہ میں پہنچا دیے ...... دروازے پر پہرہ دار شیخ (محمد غوث) کے مرید تھے، انھیں بھی مرشد کا حکم پہنچ چکا تھا، غرض تاتار خاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ فوج بابری کی جماعت کثیر اندر پہنچ گئی اور کام ہاتھ سے نکل چکا تھا، چار و ناچار قلعہ حوالہ کرنا پڑا ...... اور آپ دربار میں حاضر ہوا۔"[1]

تاتار خان کے زوال کا یہی سبب تھا کہ اس نے شاہ محمد غوثؒ کی ہدایات و نصائح پر عمل

---

[1] محمد حسین آزاد = دربار اکبری ص ۹ - ۷۷۵، مطبوعہ لاہور ۱۹۱۰ء

نہیں کیا، اور تمرد و سرکشی اختیار کی، اور بابر بادشاہ کی سرفرازی اور قلعۂ گوالیار پر فتح بھی شاہ محمد غوث کی عنایات کا نتیجہ تھی،

رسالہ عالمگیری میں بھی اس واقعہ کو نقل کیا گیا ہے جس کی تلخیص مناقب غوثیہ کے مترجم نے تتمہ کی صورت میں آخر میں منسلک کر دی ہے، اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر بادشاہ نے تاتار خاں سے شاہ محمد غوث سے ملاقات کی اجازت چاہی تھی، چنانچہ بابر نے قلعہ گوالیار میں پہنچکر شرف قدمبوسی حاصل کیا،[1]

ہمایوں بادشاہ (متوفی ۹۶۴ھ / ۱۵۵۶ء) کو بھی شاہ محمد غوث سے بڑی عقیدت تھی، ملا عبد القادر بدایونی نے لکھا ہے :-

"وہمایوں بادشاہ مغفرت پناہ را بہر دوے ایں بزرگوار (شیخ پھول و شیخ محمد غوث) نسبت عقیدت و اخلاص بکمال بود چنانچہ بہ کم کسے دیگر آں جہت داشتہ باشد وطریق دعوت اسماء ازیں اعزہ یاد می گرفتند"[2]

مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی لکھا ہے :-

"نصیر الدین ہمایوں بادشاہ از معتقدان وے گشت"[3]

پیٹر ہارڈی نے جہاں سلاسلِ طریقت کا ذکر کیا ہے وہاں تذکرۃً لکھا ہے کہ ہمایوں بادشاہ شاہ محمد غوث کا مرید تھا، وہ لکھتا ہے :-

"ایران سے نئے سلاسل آئے ــــ شطاری ــــ شیخ محمد غوث، جو اسی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے، ہمایوں کے روحانی پیشوا تھے"[4]

---

[1] محمد ظہیر الحق احمد آبادی : تتمہ مناقب غوثیہ (اردو) مطبوعہ آگرہ ۱۳۳۳ھ [2] عبد القادر بدایونی : منتخب التواریخ مطبوعہ کلکتہ .... ۱۸۶۹ء جلد سوم ص ۴ [3] مفتی غلام سرور لاہوری : خزینۃ الاصفیا، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۲۸۱ھ، ص ۲۳۳ [4] پیٹر ہارڈی : سورسز آف انڈین ٹریڈیشن، مطبوعہ نیویارک ۱۹۵۹ء ص ۴۳۸

ڈاکٹر تاراچند[1] اور دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے بھی یہی لکھا ہے[2]، اس لیے یہ مسلمہ ہے کہ ہمایوں کو شاہ محمد غوث سے بیحد عقیدت تھی، اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جب ۹۴۷ھ میں افغانوں کا غلبہ ہوگیا اور ہمایوں بادشاہ نے صوبہ دہلی سے یکسوئی اختیار کرلی تو اس وقت شاہ محمد غوثؒ بھی گوالیار سے ہجرت کرکے گجرات چلے آئے، یہاں ہمایوں بادشاہ کی طرف سے شاہ محمد غوثؒ کو یہ مکتوب موصول ہوا :-

"بعد از عرض آداب دست بوس معروض آنکہ عنایت قدیم لم یزل از کرب و دشواری تقدیر بہ بدرقہ توجہ دعائے ایشاں وجمیع درویشاں بہ آسانی برآوردہ واز سوانح زنگار فتنہ انگیز آنچہ پیش آمد بجز محرومی ملازمت باعث آزاری خاطر وسبب تیرگی دل نگردید، و درہر نفس وہر گام خیال در گرد ایں اندیشہ بود کہ آں دیو سرشت مردم بآں ذات ملکوت صفات چہ سلوک کردہ باشند، چوں شنید کہ درہماں نزدیکی ایشاں نیز ہجرت بہ دیار گجرات فرمودند، دل ازاں اندوہ گرفتاری بقدرے رہائی یافت، وپیوستہ از صدق عقیدت امیدوار کہ فیض فضل کردگار رحیم جہاں کہ از تنگنائے آفت بیروں آوردہ از بند اندوہ ناکی ذکور آزاد ساخت از محنت مفارقت صوری نیز خلاصی بخشند۔

سبحان اللہ چہ گونہ سپاس وشکر گزاری تلقین باطن نشیں آں رہنمائے حقیقی بتقدیم رساند کہ باکثرت اسباب پریشانی کہ بظاہر قالب فرد پیچیدہ ست در جمعیت و وحدت سر سودائے قلب باندازہ یک ذرہ تصورے راہ وفتورے نیافتہ۔ راہ آمد ورفت قافلۂ دعائے خیر پیوستہ مسلوک باد!" (محمد غوثی : گلزار ابرار، مطبوعہ ۱۳۲۶ھ، ص ۳-۲۹۲)

---

[1] ڈاکٹر تاراچند : انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر، مطبوعہ الہ آباد [2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام : مطبوعہ لیڈن ہالینڈ ۱۹۱۳ء، ص ۸-۶۸۷

شاہ محمد غوث نے مذکورہ بالا مکتوب شاہی کے جواب میں جو یہ صحیفہ ارسال فرمایا:-

"وصول نامہ نامی سلطانی و مطالعہ صحیفہ گرامی ہمایونی مبارک باد زندگانی بہ مخلصان این حدود رسانید و نوید سعادت صحت و عافیت ملازمان رکاب دولت بر داد — آن چہ بہ کلک وقائع نگار رقمی بود مطابق نفس الامرست ہیچ گونہ تکلفے دراں واقع نیست - مصرع

سخن کز دل بروں آید نشیند لاجرم در دل

المرام سر خداوندا خبر از اندوہ ناکی سرگزشت شوریدہ مباد! مصرع

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست

ہرگاہ حق سبحانہ وتعالیٰ بندہ سعادت مند خود را می خواہد بدرجہ کمال رساند، پرورش بہ اسمائے جمال و جلال بر دو می فرماید۔ یک دور جمالی گزشت — اکنوں روز نوبت جلالی ست، بحکم فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا — بزودی باز نوبت جمال خواہد رسید، زیرا کہ بقانون عربیہ یک "عسر" بیان دو "یسر" واقع شدہ و زود بہ جہت آنکہ سطح محاطا بجب مسافت کمتر از دائرہ محیط ست پس عنقریب عروس مراد بر منصۂ ظہور جلوہ گر خواہد شد، ان شاء اللہ تعالیٰ" (گلزار ابرار، ص ۴-۲۹۳)

ملا عبد القادر بدایونی نے لکھا ہے کہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ صغر سن ہی میں شاہ محمد غوثؒ کا معتقد ہو گیا تھا،

"و بادشاہ را در صغر سن بتحریض و ترغیب تمام بوسائل و وسایط در سلک ارادت خود آوردہ" (منتخب التواریخ، جلد سوم ص ۵ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء)

معتمد خاں نے اقبال نامہ میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، جس کو محمد حسین آزاد نے دربار اکبری میں اپنے انداز سے اس طرح بیان کیا ہے:-

"۹۶۶ھ میں کہ ابھی اکبر کو سلطنت سے تعلق نہ تھا، شکار کھیلتے ہوئے گوالیار کی طرف جا نکلا، گجرات میں گائے بیل بہت خوب ہوتے ہیں، اثنائے شکار میں پلنگ بانوں اور آہو بانوں نے کہا کہ شیخ انہی دنوں میں گجرات سے آئے ہیں، ان کے قافلے میں بہت اچھے اچھے بیل ہیں اور شکار میں کار آمد ہیں، بادشاہ نے کہا کہ سوداگروں کو بلواؤ، کوئی بول اٹھا کہ شیخ اور ان کے بھائی بندخود بھی لائے ہیں، سوداگروں کے پاس ویسے نہیں ہیں، گوالیار کا قلعہ بہت مشہور تھا، ایک دن بادشاہ شکار کو اٹھے تو قلعہ دیکھا اور پھرتے ہوئے شیخ موصوف کے گھر چلے گئے..... انھوں نے جس طرح کے تحفے کہ پیر ان اہل طریقت دیا کرتے ہیں پیش کیے..... اور چونکہ انھیں بھی پتہ لگ گیا تھا، اس لیے تحائف گجرات و دکن کے ساتھ عمدہ عمدہ گائیں اور بیل بھی نذر کیے، دسترخوان بھی چنا، مٹھائیاں کھلائیں، عطر لگائے، خاتمۂ صحبت میں کہا کہ آپ کسی کے مرید بھی ہیں؟ اکبر نے کہا، نہیں، خود بڑھ کر دونوں ہاتھ پکڑ لیے... اور مہمان کو مریدی کی رسی میں باندھ لیا۔" (دربار اکبری، ص ۷۷۹)

غرض اپنے والد نصیر الدین محمد ہمایوں اور دادا ظہیر الدین محمد بابر کی طرح جلال الدین محمد اکبر بھی شاہ محمد غوثؒ سے خاص ربط خاطر رکھتا تھا، چنانچہ جب شاہ محمد غوثؒ اکبر آباد تشریف لائے اور بیرم خاں و شیخ گدائی کے ناروا سلوک سے خاطر برداشتہ ہو کر واپس گوالیار گئے تو اکبر بادشاہ بیرم خاں سے آزردہ ہو گیا، اس ربطِ خاص کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بیرم خاں کی شہادت کے بعد آپ پھر اکبر آباد تشریف لے آئے، اور یہیں انتقال فرمایا، اور گوالیار میں دفن کیے گئے،

صاحب فیضان ولایت نے بھی ۹۶۶ھ میں اکبر کا گوالیار آنا لکھا ہے، مگر شاہ محمد غوثؒ سے متعلق مذکورہ واقعہ کی طرف اشارہ تک نہیں کیا، اور اس کے بجائے اپنے جد امجد شیخ خانوں گوالیاری (متوفی ۹۴۰ھ / ۱۵۳۲ء) سے اکبر کی ملاقات کا ذکر کیا ہے، حالانکہ کسی مستند تذکرہ میں اس واقعہ کا ذکر نہیں ملتا،

معلوم نہیں ان کا ماخذ کیا ہے، انھوں نے ایک عجیب وغریب حکایت لکھی ہے کہ

"۹۶۶ھ میں اکبر بادشاہ والی تخت ہندوستان، گوالیار آئے اور آپکے (شیخ خانوں) پاس حاضری چاہی تو آپنے ملاقات سے انکار فرمادیا، اس زمانہ میں "تان سین" روزانہ صبح کاذب کے وقت مزار پرانوار حضرت غریب نواز، شاہ ولایت پر حاضری دیا کرتے تھے، جب اکبر کو یارائے زیارت نظر نہ آیا تو ایک دن وہ حضرت تان سین کا لباس پہنکر ان کی حاضری کے وقت مزار مبارک شاہ ولایت پر حاضر ہوئے، اور نادیر غنا ونغمہ سازی میں مصروف رہے حضرت بندگی احمد صاحبؒ نے دوستی بظاہر جواہر کے دانے اکبر کی گود میں ڈال دیے، اور باطناً انعام خاص سایۂ رحمت پروردگار سے مالامال فرمادیا، اکبر سلام وقدم بوسی اور آستانہ پر جبیں سائی کے بعد رخصت ہوئے، اکبر نے بہت زر وجاگیر نذر گزرانی چاہی، مگر آپ نے کہا نفیر کو نمک کی کنکری اور سوکھی روٹی بہت کافی ہے" (فیضان ولایت ص۲۲)

فاضل مؤلف نے اکبر کو جس انداز سے شیخ احمد کے سامنے پیش کیا ہے وہ قرین عقل نہیں، ظاہر ہے کہ اکبر و تان سین میں کسی قسم کی مماثلت نہ تھی، اس لیے اشتباہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر اکبر تان سین جیسا مطرب بھی نہیں تھا، کہ شیخ احمد فرق تک محسوس نہ کرسکے اور دھوکے میں آگئے، یہ حکایت آپ اپنی تردید کرتی ہے،

جلال الدین محمد اکبر نے از راہِ نوازش وعنایت اور عقیدت ومحبت، شاہ محمد غوث کے لیے خزانۂ شاہی سے وظیفہ بھی مقرر کیا تھا، صاحب مآثرالامرا نے لکھا ہے:-

"گویند کہ از جناب عرش آشیانی یک کرور درہم وظیفہ بود" (بحوالہ شیخ محمد اکرام: رود کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء)

اسی طرح صاحب ذخیرۃ الخوانین نے لکھا ہے:-

"شیخ ز لک روپیہ در جاگیر داشت وچہل خیل در فوج ادمی رفت" (د،

غرض ہمعصر بادشاہوں اور حکمرانوں کو شاہ محمد غوثؒ سے خاص عقیدت ومحبت تھی، ابوالفضل نے آئین اکبری میں آپ کو اس عہد کے اجلۂ مشائخ میں شمار کیا ہے[1]، تھامس ولیم بیل کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ:-

"آپ مستجاب الدعوات تھے، جو پیشین گوئی فرماتے تھے، پوری ہو جاتی تھی، اس وجہ سے آپ کافی مشہور ومعروف تھے، اور اولوالعزم بادشاہ بھی آپکے دربار میں حاضر ہوکر آداب بجالاتے تھے"[2]

نورالدین جہانگیر بادشاہ بھی شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کے علوے مرتبت کا قائل تھا، بارہویں جشن نوروز کے ذیل میں جو حالات لکھے ہیں اس میں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۷ھ / ۱۵۸۸ء) کے روضہ کی زیارت کے تاثرات کا بیان ہے، اسی ضمن میں شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کا بھی ذکر آگیا ہے، لکھتا ہے:-

"شیخ وجیہ الدین، شیخ محمد غوث کے ایسے بلند مرتبہ خلیفہ تھے جن پر خود مرشد کو فخر ہوتا ہے، شیخ محمد غوث سے شیخ وجیہ الدین کی ارادت وعقیدت سے خود شیخ محمد غوث کے بزرگ و برتر مرتبے کا پتہ چلتا ہے"[3] (ص ۴۵۰)

---

[1] ابوالفضل: آئین اکبری، جلد اول ص ۴۸۹ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۸ء

[2] تھامس ولیم بیل: اورنٹیل بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۷-۱۸۶ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۱ء

[3] جہانگیر بادشاہ: تزک جہانگیری (اردو) ص ۴۵۰ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء

غزلیاتِ ظہیر اور انکا مصنف

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

ظہیر فاریابی (م ۵۹۸ھ[1]) فارسی کے نہایت مشہور و مقبول شاعروں میں ہے، اس کا دیوان متعدد بار زیور طبع سے آراستہ ہوا لیکن بدقسمتی سے رطب و یابس سے کبھی پاک نہیں ہوا، ایران میں جو نسخہ لیتھو میں چھپا تھا، اس میں شمس طبسی اور ظہیر اصفہانی کا کلام شامل تھا، اس سلسلے میں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا تاریخ ادبیات (ج ۲ ص ۸۵۰) میں لکھتے ہیں:-

"اس مطبوعہ نسخے میں ظہیر فاریابی اور شمس طبسی کے کلام شامل ہیں۔ یہاں تک کہ بعض قصیدوں کے آخر میں شمس تخلص بھی درج ہے، جس سے ناشر نے اپنی علمی کم مایگی سے یہ نتیجہ نکالا کہ ظہیر فاریابی جوانی میں شمس تخلص اختیار کرتا تھا۔ اس نسخے میں بہت سی غزلیں جو ظہیر فاریابی کے نام سے شامل ہیں وہ دراصل ظہیر اصفہانی کی ہیں جو دورِ صفویہ کا شاعر ہے:"

نولکشور کے مطبوعہ نسخے میں بھی ظہیر اصفہانی کی غزلیں شامل ہیں چنانچہ حال ہی میں ڈاکٹر غلام مصطفی صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی نے اس طرف توجہ کی اور اپریل ۱۹۶۲ء کے معارف میں ایک فکر انگیز

[1] خواجہ عبدالرشید صاحب نے معارف جون ۶۲ء کے شمارے میں اس تاریخ پر ایراد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس غلط تاریخ کے لکھنے سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کے مضمون کا زور ختم ہو جاتا ہے، خواجہ صاحب نے نولکشور کے چھپے ہوئے نسخے کے خاتمۃ الطبع کی دی ہوئی تاریخ ۵۵۹ھ کو ظہیر کی صحیح تاریخ وفات سمجھا ہے، حالانکہ اس صورت میں ظہیر کا بہت سا کلام دوسرے کا ماننا پڑیگا، دیوان میں ۵۸۲ھ میں ہونے والے طوفان کی پیشین گوئی کے متعلق دو قطعے ہیں، متعدد نظمیں طغرل بن ارسلان (۵۷۳ھ۔ ۵۹۰ھ) قزل ارسلان (۵۸۱ھ۔ ۵۸۷ھ)، اتابک نصرۃ الدین (۵۸۷ھ بعد) کی مدح میں ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب کا اعتراض بے محل ہے۔

نوٹ شائع کیا، چونکہ اس نوٹ میں ایران کے حال کے چھپے ہوئے نسخے کا حوالہ نہ تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید ابھی یہ نسخہ ان کے مطالعے سے نہیں گذرا، اس ایرانی مطبوعہ نسخے کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ اس کے مرتب آقائے ہاشم رضی نے شمس طبسی سے متعلق الحاق کی طرف تو توجہ کی لیکن ظہیر اصفہانی کا کلام اس دیوان میں جوں کا توں رہنے دیا، اور یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ انھیں اس بات کا علم تھا کہ ظہیر فاریابی اور ظہیر اصفہانی کا کلام گڈمڈ ہو چکا ہے، اس کے باوجود انھوں نے اس کی طرف کسی طرح کا اشارہ کیا اور نہ دونوں کے کلام میں فرق کرنے کی کوشش کی، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کے مذکورۂ بالا بیان میں ظہیر فاریابی کے کلام میں ظہیر اصفہانی کے اشعار کے ملنے کا صراحۃً ذکر ہے، اور ساتھ ہی ظہیر فاریابی کی غزلیات کی خصوصیات بھی درج کی ہیں، آقائے رضی نے ڈاکٹر صفا کے اس بیان کو تو لے لیا جو خصوصیات سے متعلق تھا لیکن الحاق کے مسئلہ کو یکسر نظر انداز کر دیا، حالانکہ ڈاکٹر صفا نے اس الحاق کی وجہ سے دیوان ظہیر فاریابی کی طباعت پر اس طرح زور دیا تھا:

"بہمین سبب طبع مجددی از دیوان ظہیر لازم بنظر می آید"

ظہیر فاریابی کی طرف منسوب دیوان کے نسخے دو طرح کے ملتے ہیں، ایک وہ جن میں غزل کا حصہ کم و بیش صرف اسی قدر ہے جتنا مطبوعہ دیوان (نولکشور) میں ہے، اس طرح کا ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے کتاب خانے میں موجود ہے جس کی کتابت ۱۲۹۵ھ میں ہوئی ہے، دوسری قسم ان نسخوں کی ہے جن میں غزل کا حصہ بہت ہی کم ہے، بلکہ بعض میں بالکل نہیں ہے، اس قسم کا بھی ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے، اس میں غزلیات کے تحت حسب ذیل غزلیں درج ہیں۔

۱۔ اقبل الساقی بریحان و روح

۲۔ یا من جوالمعالی بالصارم الہندی

۳۔ گر گلِ رخسار تو عزمِ گلستان میکند

۴۔ باز[1] بر جانم فراقت پادشاہی میکند

۵۔ یارب سببی ساز کہ آں سرو، دل را

۶۔ ای ہمایوں نظر از من نظری باز مگیر

۷۔ حنکہ ہر شب در خیالت دیدہ در خون کشیم

۸۔ یار می خوارۂ من دی قدح بادہ بدست

ان میں پہلی دو کے علاوہ جو قطعات کے ذیل میں تہرانی ایڈیشن (ص ۱۶۱، ۱۶۵) میں موجود ہیں، بقیہ چھ غزلیں جو اگرچہ تہرانی ایڈیشن میں (ص ۲۳۳، ۲۳۴، ۱۸۶، ۲۳۸، ۲۷۱، ۲۰۱) موجود ہیں مگر لکھنؤ ایڈیشن میں شامل نہیں ہیں، اس کے علاوہ ایک مزید غزل تہرانی نسخے میں پائی جاتی ہے، جو لکھنؤ ایڈیشن کے علاوہ مسلم یونیورسٹی کے نسخے سے بھی خارج ہے، وہ غزل یہ ہے:۔

سوز عشقت نشان جان ببرد طاقت از دل ز تن توان ببرد

ان میں تین غزلوں یعنی یہ آخری اور نمبر ۳، ۴ کے پیش نظر ہاشم رضی مرتب نسخہ فرماتے ہیں:

"بعضی از غزلیات ظہیر کہ البتہ بیش از سہ یا چہار غزل نیست در مدح نصرۃ الدین سرودہ شدہ و بہیچ روی با غزلہای دیگر او شبیہ نیست" (مقدمہ ص ۴۵)

مختصر یہ کہ تہرانی ایڈیشن میں ظہیر فاریابی کی بعض اصل غزلیں بھی شامل ہیں جنکی تعداد بہت کم ہے، اور جو لکھنؤ ایڈیشن میں شامل نہیں لیکن یہ مسلّم ہے کہ یہ دیوان ظہیر فاریابی کی تمام غزلوں پر ہرگز حاوی نہیں، سید عبد الرحیم خلخالی نے دیباچہ دیوان حافظ (ص لج) میں ظہیر کی غزل کا ایک مطلع درج کیا ہے جو مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے، وہ مطلع یہ ہے:۔

ز خواب خوش چو برانگیخت عزم میدانش مہ دو ہفتہ پدید آمد از گریبانش

[1] ڈاکٹر صفا نے ایک ہی غزل نقل کی ہے (تاریخ ادبیات ج ۲ ص ۷۶۳)

ڈاکٹر غلام مصطفٰے نے الحاق کے سلسلہ میں پانچ دلیلیں پیش کی ہیں جن میں سے پہلی کے علاوہ سب ظنی ہیں، اگرچہ پہلی دلیل یعنی تخلص کا التزام ہر غزل تا خر زمانی کا پتا دیتا ہے، بھی کافی وزن رکھتی ہے لیکن قطعی اس لیے نہیں ہے کہ جو غزلیں ظہیر فاریابی کی یقینی ہیں ان میں سے اکثر میں تخلص آیا ہے گو بعض تخلص سے خالی بھی ہیں، آقائے صفا[1] نے بھی ظہیر فاریابی کے تخلص استعمال کرنے کا ذکر کیا ہے۔

دوسری دلیل یعنی دیوان میں بعض کتابیں ایسی مذکور ہیں جو ظہیر سے بعد کی ہیں، یقیناً محکم اور قطعی دلیل ہے، خواجہ عبد الرشید صاحب[2] کا یہ استدلال کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مصنف جب کتاب کا نام تجویز کرتے ہیں تو کسی کے کلام سے تراکیب مناسبہ مستعار لے لیتے ہیں، اس لیے ہو سکتا ہے کہ ظہیر فاریابی نے "مخزن اسرار"، "گلشن راز"، "شرح مطول" وغیرہ تراکیب کا مناسب استعمال اپنے کلام میں پہلے کر لیا ہو اور بعد میں لکھنے والوں نے ان تراکیب کو مستعار لے کر اپنی اپنی کتابوں کا نام رکھ لیا ہو" نہایت دور از کار اور غلط ہے، البتہ خواجہ صاحب نے یہ صحیح ایراد کیا ہے کہ "کیمیائے سعادت" ظہیر فاریابی کے بعد کی تالیف نہیں پہلے کی ہے، اس سے واضح ہو گیا کہ دیوان ظہیر میں ایسی کتابوں کے بھی نام ہیں جو ظہیر فاریابی سے پہلے کی ہیں، ایسی حالت میں پہلے کے مصنف نے دیوان ظہیر سے کیونکر نام مستعار لیا، حقیقت یہ ہے کہ ظہیر کی طرف منسوب غزلوں میں کتابوں کا نام استعارۃً آیا ہے، ان میں ایسی بھی کتابیں ہیں جو فاریابی سے پہلے کی ہیں اور ایسی بھی ہیں جو اس سے بعد کی ہیں، بعد کی کتابوں کا نام آنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہ دیوان ظہیر فاریابی کا نہیں ہو سکتا، اگر ان تمام ابیات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے، مثلاً ایک[3] جگہ ہے:

یک شمہ از شفا و اشارات چشم یار افشا مکن کہ بتدیان را خبر شود

شرح مطول سر زلف تو بر ہم است پنداشت دل چو رمز لبت مختصر شود

[1] تاریخ ادبیات ج ۲ ص ۷۵۰ [2] معارف جون ۱۹۶۲ء ص ۴۶۲ [3] دیوان ص ۲۳۲

یا مثلاً یہ شعر[۵]:-

اکسیر کیمیاے سعادت دل منست | گوگرد احمرم کہ طلا را کنند نحاس

یا مثلاً یہ چند بیت[۶]:-

مطربا کاش بہ قانون بنوازی ما را | کز رگ جان حزیں رشتۂ ساز آوردم
شرح ابروش ز دیباچۂ آں چہرہ ظہیر | شاد مینی است کہ از گلشنِ راز آوردم
مخزن[۷] اسرار معنی ابر گوہر بار ماست | درّ درجِ معرفت لعل لب گفتار ماست

ان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ان اشعار کے مصنف نے "شفا" "اشارات" "شرح مطول" "کیمیاے سعادت" "قانون" "گلشن راز" اور "مخزن اسرار" کا ذکر کتاب سمجھ کر کیا ہے، شرح، دیباچہ، بیت کے ساتھ گلشن راز سواے محمود شبستری (م ۷۲۰ھ) کی مشہور و معروف کتاب کے اور کیا ہو سکتی ہے، اسی طرح جہاں "شفا"، "اشارات"، "شرح مطول" کا ذکر ہے، ان سے سواے ابن سینا کی "کتاب الشفا" اور "کتاب الاشارات" اور تفتازانی (م ۷۹۲ھ) کی کتاب مطول کی شرح کے اور کیا سمجھا جائے، اس سے واضح ہے کہ مصنف دیوان نے دیدہ و دانستہ ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے ابن سینا (متوفی ۴۲۸ھ)، امام غزالی (متوفی ۵۰۵ھ) دونوں قطعاً فاریابی سے متقدم اور نظامی معاصر[۸]، اور گلشن راز اور شرح مطول کے مصنفین بعد کے ہیں، اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ زیر نظر دیوان ہرگز ظہیر فاریابی کا نہیں ہو سکتا، اسی لیے خواجہ عبد الرشید صاحب کا قیاس بے معنی ہے،

ڈاکٹر غلام مصطفی کا یہ استدلال کہ جس دیوان میں چہار باغ اصفہان کا ذکر آئے وہ ظہیر فاریابی

[۵] دیوان ص ۲۸۰ [۶] ایضاً ص ۲۶۱ [۷] ایضاً ص ۱۹۲ [۸] نظامی کی تاریخ وفات میں سخت اختلاف ہے مختلف تذکروں میں مختلف تاریخیں ملتی ہیں یعنی ۵۷۰، ۵۷۶، ۵۹۲، ۵۹۹، ۶۰۲، ۶۰۶، ۶۱۴، ۶۱۹ آقای صفا نے ۶۱۴ ہجری صحیح بتائی ہے،

کا کیونکر ہو سکتا ہے، کس قدر وقیع ہے، چار باغ والے شعر کو ایک اور بیت سے ملا کر پڑھیے تو صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف اصفہان کا باشندہ ہے، مثلاً

ز سیر چار باغ از دیدہ ام زایندہ رود آمد | صفاہان بر من بیچارہ زندان است در واقع
ساز عراق کن کہ دلت واشود ظہیر | کی بینوا است تا بود اندر وطن گرہ

ظہیر فاریابی کا وطن فاریاب ہے، اصفہان اور عراق سے اس کا کیا تعلق ؟

چار باغ کی بنیاد ۱۰۰۶ھ میں پڑی، اس کی تفصیل درباری مورخ اسکندر منشی نے عالم آرائے عباسی (ج ۲ ص ۵۴۴، ۵۴۵) میں سال یازدہم جلوس کے تحت بیان کی ہے، چند جملے ملاحظہ ہوں:

> لہذا درین سال مطابق ست والف ہجری است رای جہان آرای بدان قرار گرفت کہ دار السلطنت مزبور (اصفہان) را مقر دولت ابد مقرون ساختہ عمارات عالی طرح نمایند .... و ایام بہار .... از درب شہر یک دروازہ درحریم باغ نقش جہان واقع و بدرب دولت موسوم است از آنجا تا کنار زایندہ رود خیابانی احداث فرمودہ چہار باغی در ہر دو طرف خیاباں و عمارات عالیہ در درگاہ ہر باغ طرح انداختند ....

در تاریخ طرح چہار باغ گفتہ شدہ بود۔

عجب چار باغی است بہجت فزا | گرش ثانی خلد گویند شاید
چو تاریخ آں دل طلب کرد گفتم | نہالش بکام دل شہ بر آید

اسی ضمن میں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ زیر بحث دیوان کا مصنف کرمان میں بھی رہا ہے[۱] اور چونکہ ظہیر فاریابی کا کرمان سے کسی قسم کا تعلق ظاہر نہیں ہے، اس سے بھی توثیق ہوتی ہے کہ یہ دیوان فاریابی کا نہیں۔

ما را ہرات رزق ز کرمان بریدہ شد | زیں پس بنام شاہ خراسان نوشتہ اند

[۱] سب سے اہم ثبوت جس کا ذکر ڈاکٹر غلام مصطفی نے کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ایک مقطع میں اپنے کو عماد کا شاگرد بتایا ہے،
بشعر فخر ازان میکند ظہیر کہ ہمر | چو خامہ بر خط تعلیم عماد پا دارد

حسین پژمان کے مجموعہ "بہترین اشعار" میں ظہیر اصفہانی کے نام کے جو شعر اس دیوان میں موجود ہیں جن کی طرف ڈاکٹر غلام مصطفےٰ نے اشارہ کیا ہے، ان کے علاوہ بعض اور کتابوں میں ظہیر فاریابی اور ظہیر اصفہانی کے نام سے الگ الگ اشعار درج ہیں، مثلاً "گلزار ادب" (مرتبہ حسین کی چاپ دوم سنہ ۱۳۲۰ شمسی) میں گیارہ متفرق ابیات کے تحت ظہیر اصفہانی کا تخلص مع وطنی نسبت کے موجود ہے، منجملہ ان کے دو غزلوں[1] کے پورے اشعار درج ہیں، ان میں سے یہ دو ابیات اس دیوان میں نہیں ملتے۔

بوسہ ای بخشید دو شم زآن دہن   در جہان تنگی نہی بخشند گی

بجان فروشی اگر بوسہ زاں لب شکرم   قسم بجان عزیزت کہ رایگان نخرم

اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ظہیر فاریابی کے نام سے جو چند ابیات "گلزار ادب" (ص ۱۸۳-۲۱۲) میں درج ہیں، ان میں سے دو بیت دو غزلوں کی ہیں، جو اس تہرانی ایڈیشن میں شامل ہیں (دیکھئے ص ۱۹۸، ۱۸۴ بالترتیب) اس سے واضح ہے کہ مرتب "گلزار ادب" بھی اس الحاق کے معاملے کو پوری طرح سلجھا نہ سکے،

ذیل میں چند امور کی طرف مزید توجہ دلائی جاتی ہے:

۱- دیوان ظہیر فاریابی میں بعض جگہ طرز خط استعارۃً استعمال ہوا ہے، مثلاً

در دلم از خط سبز خود سوادی دید و سفت   کیں سفال کہنہ مشق خط ریحاں میکند (ص ۲۲۳)

خط یاقوت شد نسخ از غبار سبز خط او   ہنوز ش سر زند بینی و ریحان است در رد توقیع

ندارد رتبہ چنداں کہ ریحاں خوانم آں خط را   خط دو رعذارش خط قرآن است در واقع

خط ریحاں تو قدیم ہے اور اس کی ایجاد[2] کا سہرا ابن مقلہ م سنہ ۳۲۸ھ) کے سر باندھتے ہیں،

[1] دیکھئے ص ۲۰۲ اور ۳۲۸۔ یہ دونوں غزلیں دیوان کے ص ۱۹۸ (نمبر ۷۰) اور ص ۲۸۰ (نمبر ۳۰۴) پر موجود ہیں۔

[2] ریحان کے علاوہ اس نے محقق، ثلث، نسخ، توقیع، رقاع بھی ایجاد کئے، گویا جملہ قدیم خط تھے سب اسی خط کی جدت طبع کا نتیجہ ہیں (تفصیل کے لیے دیکھئے "پیدائش خط و خطاطان" ص ۹۰-۱۰۷)

لیکن خط یاقوت یاقوت مستعصمی کا خط ہے، جو مستعصم باللہ (سنہ ۶۴۰ھ-سنہ ۶۵۶ھ) کے دور کا خطاط ہے اور جس کی تاریخ وفات سنہ ۶۹۷ھ[1] بتائی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ جب یاقوت ظہیر فاریابی کا معاصر نہیں تو جس دیوان میں خط یاقوت کا ذکر موجود ہو وہ ظہیر فاریابی کا دیوان نہیں ہو سکتا، خط غبار بھی بعد کا ہے، لیکن فی الحال اس کی کوئی تاریخ پیش نہیں کی جا سکتی،

۲- ظہیر نے متعدد غزلیں حافظ کے جواب میں لکھی ہیں، جن سے ایک طرف تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ حافظ کا پیرو ہے[2]، دوسری طرف اس کا تاخر زمانی بھی واضح ہو جاتا ہے، بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ حافظ نے ظہیر فاریابی کی پیروی کی ہو گی لیکن یہ محض وہم ہے، اس لیے کہ زبان اور انداز بیان دونوں سے حافظ کا تقدم زمانی ثابت ہے، دوسری بات یہ ہے کہ حافظ کے لیے ایک ایسے شاعر کا تتبع جس کا غزل میں کوئی مرتبہ نہ ہو (اور جس کا ذکر کہیں بھی نہ ہو) مستبعد معلوم ہوتا ہے، ذیل میں حافظ اور ظہیر کی بعض موازی غزلیں پیش کی جاتی ہیں، تاکہ قارئین کو حقیقت حال کا اندازہ ہو جائے،

حافظ	ظہیر (نمبر ۱)
اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا	ندانم از چہ دستی می کشد زلفِ سمن سارا
بخالِ ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را	عجب نبود کہ می خواہد بدست آرد دلِ مارا
اگر دشنام فرمائی وگر نفرین دعا گویم	لب آں جام می بوسم دہانم می شود شیریں
جواب تلخ میزیبد از آں لعل شکرخوارا	حلاوت بیں کہ بوسیدہ است آں لعل شکرخوارا

[1] تاریخ وفات کا قطعہ یہ ہے:- یاقوت جمال دیں شہ اہل ہنر   در صبح خمیس سادس شہر صفر

در سبعہ وستین بد وستہ مائتہ   کز دار فنا بآخرت کرد سفر

(پیدائش خط و خطاطان ص ۲۶۴ [illegible])

مگر تذکرۂ خوشنویسان میں سنہ ۶۹۸ھ درج ہے (ص ۲۴) [2] ڈاکٹر غلام مصطفےٰ نے لکھا ہو کہ ظہیر کے ایک قلمی نسخے (اسلامیہ کالج پشاور) سے ظاہر ہے کہ اس نے حافظ کا ایک مصرع تضمین کیا ہے،

حافظ	ظهیر (نمبر ۳)
الا یا ایها الساقی ادر کاساً و ناولها	من از باد صبا یاد ندادم حل مشکلها
که عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکلها	چه حاصل عقده از زلفت کشود و بست از ما
شب تاریک و بیم موج و گردابی چنین هائل	ظهیر از موج این دریای بی پایان نمیندیشد
کجا دانند حال ما سبکباران ساحلها	خبر از وی بپرس نزدیک بیداران ساحلها
حاصل کارگه کون و مکان این همه نیست	با غم من نفس مرده دلان این همه نیست
باده پیش آر که اسباب جهان این همه نیست	مستی مرگ بدین خواب گران این همه نیست
از دل و جان شرف صحبت جانان غرض است	تا تو در شیشه و خم باده کنی عید آمد
غرض این است وگرنه دل و جان این همه نیست	باده پیش آر که ماه رمضان این همه نیست
تو بی که بر سر خوبان کشوری چون تاج	زهی به تیر غمت صد هزار دل آماج
سزد اگر همهٔ دلبران دهندت باج	گرفته ناز تو از حسن ملک خوبان باج
همای اوج سعادت ببام ما افتد	شبی اگر گذرت بر مقام ما افتد
اگر ترا گذری بر مقام ما افتد	نه دل نه زهره نه گردون ببام ما افتد
حباب وار براندازم از نشاط کلاه	زمان مستی ما آن زمان بود ای ماه
اگر ز روی تو عکسی بجام ما افتد	که از عذار تو عکسی بجام ما افتد
شبی که ماه مراد از افق شود طالع	هزار عاشق بیدل که رو بدر دارند
بود که پرتو نوری ببام ما افتد	کجا بفکر جواب سلام ما افتد
ببارگاه تو چون باد را نباشد بار	هزار نامه فرستادم و نشد که یکی
کی اتفاق مجال سلام ما افتد	بدست دلبر عالی مقام ما افتد

حافظ	ظهیر (نمبر ۱۴۴)
حسب حالی ننوشتیم و شد ایامی چند	با صبا میروم امشب بگلستانی چند
محرمی کو که فرستم بتو پیغامی چند	تا گشائیم گره از سنبل و ریحانی چند
نصیحتی کنمت بشنو و بهانه مگیر	مده فریب من ای دل ز آب زنجیر (ر۱۴۲)
هر آنچه ناصح مشفق بگویدت بپذیر	بشوی لوح ضمیر مرا ز موج حصیر
دل رمیدهٔ ما را که پیش میگیرد	ز قید زلف رهاند این دل پریشان را
خبر دهید بمجنون خسته از زنجیر	دریغ داشت ز دیوانه منصب زنجیر
منم که دیده بدیدار دوست کردم باز	نیاز جلوه رود همعنان جلوهٔ ناز (ر۱۴۹)
چه شکر گویمت ای کارساز بنده نواز	چو سرو رقص کند قمری آورد آواز
زنیم بوسه دعائی بجز ز اهل نیاز	بشنید آرزوی بوسه گیری لب تو
که کید دشمنت از جسم و جان دارد باز	دهان ساغر از آن مانده تا قیامت باز
بر نیامد از تمنای لبت کامم هنوز	ساکن بتخانه و در قید اسلامم هنوز (ر۲۴۹)
بر امید جام لعلت دردی آشامم هنوز	خاکروب دیر و در بیت احرامم هنوز
روز اول رفت دینم در سر زلفین تو	من که سودای فراغ از نکهت آن شانه ام
تا چه خواهد شد درین سودا سرانجامم هنوز	تا چه باشد ز زلف او سرانجامم هنوز
گلعذاری ز گلستان جهان ما را بس	جلوه از قدت ای سرو روان ما را بس
زین چمن سایهٔ آن سرو روان ما را بس	موی از زلف تو سررشتهٔ جان ما را بس
ای صبا گر گذری بر ساحل رود ارس	تا بشنید آرزو محکم بود پای مگس
بوسه زن بر خاک آن وادی و مشکین کن نفس	کم مباد تا ابد عشق مجاز از بوالهوس

حافظ	ظہیر
منزل سلمیٰ کہ بادش ہردم از ما صد سلام	وحشیان نجد را ہم آن شب از آرام برد
بر صدای ساربانان بینی و بانگ جرس	کاشکی با محمل لیلیٰ نمی بودی جرس
عشرت شبگیر کن می نوش کاندر راہ عشق	زلف او رہزن شود چشمش چو گردد مست خواب
شبروان را آشنائی ہاست با میر عسس	شبرو طرار خیزد چون بیار اید عسس
برد از من قرار و طاقت و ہوش	قدش از جلوہ غارت میکند ہوش (۱۹۱)
بت سنگیں دل سیمیں بنا گوش	بلا باشد اگر بینم در آغوش
چو پیراہن شوم آسودہ خاطر	مگر بیہودہ ای رضوان کہ فردوس
گرش ہمچو قبا گیرم در آغوش	ندارد نزہت خلد بنا گوش
اگر رفیق شفیقی درست پیمان باش	دلا چو غنچہ خس پوش و پاکدامان باش (۱۸۹)
حریف خانہ و گرمابہ و گلستان باش	بنالہ ہمنفس بلبلان مستان باش
قسم بحشمت و جاہ جلال شاہ شجاع	قسم بتاج سلیمان و آفتاب شعاع (۲۵۱)
کہ نیست با کسم از بہر مال و جاہ نزاع	کہ خسروان ہمہ او را مطیع ہست و مطاع
ببین کہ رقص کنان میرود بنالۂ چنگ	خوشا شرارۂ عشقی بدل کہ ہمچو سپند
کسی کہ رخصہ نفرمودی استماع سماع	کنم ترانۂ سوزندگی برقص و سماع
شراب خانگیم بس می مغانہ بیار	نشستہ منتظر پیک کاروان رحیل
حریف بادہ رسید ای رفیق توبہ وداع	گسستہ رابطہ از دوستان کردہ وداع
سحر ببوی گلستان دمی شدم در باغ	بہ پیراہن نتوانم نہفت شعلہ داغ (۲۰۷)
کہ تا چو بلبل بیدل کنم علاج دماغ	توان میانۂ فانوس اگر نہفت چراغ

حافظ	ظہیر
بجلوۂ گل سوری نگاہ میکردم	پیالہ چند ز خون جگر کنم لبریز
کہ بود در شب تیرہ بروشنی چو چراغ	دلا تو ہم جگرے کن بزمی ایاغ
مقام امن و می بیغش و رفیق شفیق	کسیکہ خورد می از جام ساقی تحقیق (۲۱۶)
گرت مدام میسر شود زہی توفیق	ز دست حور نمی نوشد از شراب خلیق
جہان و کار جہان جملہ ہیچ بر ہیچ است	کجا ز عشق گران سنگ رنگ بردارد
ہزار بار من این نکتہ کردہ ام تحقیق	کسیکہ کوہ نشینی نمی کند چو عقیق
حلاوتی کہ ترا در چہ زنخدان است	بکنہ معرفتی شبنم خرد نرسد
بکنہ آن نرسد صد ہزار فکر عمیق	چگونہ سر بدر آرد ز قعر بحر عمیق
اگر شراب خوری جرعۂ فشان بر خاک	سپہر برزد خونریزیش نباشد باک (۲۱۹)
از آن گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک	سر بریدہ خورشید بستہ بر فتراک
ز بیب دختر رز طرفہ میزند رہ عقل	میانہ من و قمری جز این تفاوت نیست
مباد تا بقیامت خراب طارم تاک	کہ او بپایۂ سرو است و من بپایۂ تاک
ہزار دشمنم ار میکنند قصد ہلاک	نگر بمرغ چمن از نتیجہ گل و تاک (۲۲۰)
گرم تو دوستی از دشمنان ندارم باک	گلاب از تو و از من شراب آتشناک
ای رخت چون خلد و لعلت سلسبیل	تا ز شوقی از وقت رحیل (۲۲۹)
سلسبیلت کردہ جان و دل سبیل	می روم تا باشدم در رہ دلیل
یارب این آتش کہ در جان منست	بی تو بر من رنگ گلشن آتش است
سرد کن زانسان کہ کردی بر خلیل	کہ چہ آتش شد گلستان بر خلیل

حافظ	ظہیر
بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم	چو غنچہ مردہ دل تا بکی نظارہ کنم (ص ۲۴۳)
بہار توبہ شکن میرسد چہ چارہ کنم	نسیم وصل تو کو تا کہ جامہ پارہ کنم
سخن درست بگویم نمی توانم دید	شباب رفت ز دست و نساختم کاری
کہ می خورند حریفان و من نظارہ کنم	گذشت قافلۂ فیض و من چہ چارہ کنم
ای آفتاب آینہ دار جمالِ تو	گاہم بدیدہ چہرہ کشاید خیالِ تو (ص ۲۸۹)
مشک سیاہ مجمرہ گردان خالِ تو	یکبارہ ناامید نیم از وصالِ تو

ان اشعار کے مقابلے و موازنے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ ظہیر نے حافظ کی نقل کی ہے اور وہ یقیناً بہت بعد کا شاعر ہے۔

(۳) دیوان ظہیر فاریابی کے کسی قدیم نسخے میں یہ غزلیں شامل نہیں ہیں، جدید نسخوں میں ان کا شمول الحاق کو بین طور پر ثابت کرتا ہے اور اسی سے ظہیر کے زمانی تاخر کا بھی اثبات ہوتا ہے۔

(۴) تذکرہ نویسوں نے ظہیر فاریابی کی غزلیات کے نمونے نہیں درج کیے ہیں، جدید تذکرہ نویسوں میں صرف احمد علی سندیلوی نے مخزن الغرائب (تالیف ۱۲۱۸ھ) میں زیر نظر دیوان کی ایک غزل (نمبر ۱۸۶) ظہیر فاریابی کے نام سے منسوب کی ہے۔ اگر فاریابی غزل گوئی میں کوئی خاص مرتبہ رکھتا تو تذکروں میں اس کا ذکر ہوتا۔

(۵) ظہیر کے افکار و خیالات جدید ہیں، اور جدید الفاظ و فقرات بھی اس کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شاعر چھٹی صدی ہجری کے ظہیر فاریابی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ذیل کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ الفاظ و فقرات جدید:-

فرنگ، حسن افرنگ و کلیسائے فرنگ:-

جز حسن فرنگ تو کہ ز اہل کتاب است (ص ۱۹۲)
زلف او چین ست و خالش ہند و رخسارش فرنگ (،،)
کلیسای فرنگ آن دلی کہ عشق ندارد — ولیکہ عشق ندارد کلیسای فرنگ است (ص ۱۹۳)
ز غیرت آتش غم در فرنگ میگیرد (ص ۲۰۷)
فرنگیان بہ بت آزر چو متہم کردند (ص ۲۳۴)
مسا دی است بہ رنگ کلیسای فرنگ (ص ۲۵۹)
دارم بت فرنگی و بتخانہ زادہ (ص ۲۷۵)
بتی دارم فرنگی زادہ عشق کافرستانی (ص ۲۷۹)
فرنگی زادہ شوخی کافری زنار گیسوی (ص ۲۸۰)

برہمن:-

زیارت کن دلم را ای برہمن (ص ۱۹۶)
کہ غیر برہمنان از بتان چہ میدانند (ص ۲۳۲)
تا شیوۂ بتان ز برہمن کنم سوال (ص ۲۶۹)
کہ پرسد رسم آن بت از برہمن (ص ۲۷۴)

دار الشفا:-

ز بو بنیم عجب دار الشفائی بر سر کوئی (ص ۲۳۱)
مسیح بر در دار الشفای او ست جلیل (ص ۲۵۵)

کوتوالی:-

در حصار غم بعزم کوتوالی میروم (ص ۲۶۹)

گاؤتکیہ :-

فارغ چو گاؤتکیہ بدیوار دادہ ام (ص ۲۶۷)

افکار و خیالات جدیدہ :-

ہر چند چشم آینہ باریک بین بود   ما محو موشگافی مژگان شانہ ایم (ص ۲۶۶)

خدنگ قامت من در شباب شبہ چو کمان   چرا کشاکش دوران نکرد راست مرا (ص ۱۷۹)

بسکہ گشتم در غم عشقش ز مو باریک تر   می تواند داشت چشمش در صفِ مژگان مرا (ص ۱۸۰)

بر سر شاخ شود مرغ چمن سیخ و کباب   شوق اگر گرم کند شعلہ آواز ترا (ص ۱۸۱)

چشم آہو گر ببیند چشم نخچیر ترا   میدہد چوں مغز جا در استخوان تیر ترا

بیکرت آذرہ گردد از لطافت گرکشند   بر حریر برگ گل نقاش تصویر ترا

از شہیدان نگاہت ہر کرا نقشاں برنخاست   دادہ اند از سرمہ گویا آب شمشیر ترا

می شود در جان سنبل رشتہ اش پُر پیچ و تاب   گر ببیند حلقۂ زلف گرہ گیر ترا (ص ۱۸۲)

رسیدہ گوشہ ابرو بہ چشم سرمہ سای او   تو پنداری کمانداریست در دنبال آہوئی

دو پستانش ز چاک پیرہن دیدم بدل گفتم   تماشا کن کہ سرو ناز بار آوردہ لیموئی

بہ آہو نسبت چشمش چو کردم چیں بابرو زد   کہ چشم شیر گیر ماندارد ہیچ آہوئی (ص ۲۸۰)

شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جس میں اس طرح کے اشعار نہ پائے جاتے ہوں، جو متاخرین شعرائے فارسی کا انداز ہے، اور متقدمین کے یہاں سرے سے ناپید ہے، اس لیے یہ طرز ظہیر فاریابی کا نہیں ہو سکتا، اور یہی اس کی شہادت خود آقائے رضی دانش کے اس بیان سے ہوتی ہے؛

"بعضی از غزلیات ظہیر کہ البتہ بیش از سہ یا چہار غزل نیست در مدح نصرۃ الدین

سرودہ شدہ و ہیچ ردی با غزلہای دیگر او شبہہ نیست۔" (مقدمہ ص ۴ ہ)

(۶) دیوان کی ایک غزل سے پتا چلتا ہے کہ ظہیر کا رفیق کشمیری تھا جو تازہ تازہ عراق آیا تھا، یہ آمد ورفت تاخر زمانی کا پتہ دیتی ہے، اور دوسری طرف اس سے شاعر کا وطنی یا سکونتی تعلق اصفہان سے ظاہر ہوتا ہے، غزل (نمبر ۲۲۱) یہ ہے،

چیست بر زخم دلم ای بت کشمیر نمک   ناوکت داشت مگر تعبیہ در تیر نمک

تا ز ہند آمدی ای کانِ ملاحت بعراق   گشتہ یادت بدل مردم کشمیر نمک

این ملاحت کہ ترا تعبیہ در قند لب است   دایۂ تو مگر آمیختہ در شیر نمک

ان معروضات میں سے اگر سوائے نمبر (۱) کے کوئی قطعی نہیں، پھر بھی انھیں اگر ان تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے ــــ شاعر اپنے کو صائب کا شاگرد قرار دیتا ہے، چار باغ اصفہان کا ذکر کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ ــــ تو یہ امور اسی نتیجے پر پہنچائیں گے کہ ظہیر جس کا دیوان ہمارے پیش نظر ہے وہ یقیناً ظہیر فاریابی سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتا،

اردو کے چند مظلوم ادیب

از

جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

شہرت اور کمالِ فن مترادف نہیں، کتنے ہی طبیب حاذق، شہرت عام سے محروم رہ جاتے ہیں، اور کتنے ہی "نام آور" طبیب حذاقت فن سے کورے نکل جاتے ہیں، اور ایک طب پر موقوف نہیں، شعر، ادب، صحافت، وکالت ہر علم، فن اور پیشہ میں یہی حال نظر آتا ہے، اس وقت اردو کے چند ایسے ہی ادیبوں کے نام گنا دیتے ہیں، جنھیں شہرت کا وہ مرتبہ حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ ہر طرح مستحق اپنے کمال فن کے لحاظ سے تھے — غیر معروف رہ جانے کے اسباب متعدد ہو سکتے ہیں، اور ہوتے ہیں، یہاں مقصود اُن اسباب کی تشخیص اور ان کا تجزیہ نہیں، بلکہ نفس واقعہ یعنی ان ادیبوں کی غیر معروفیت بلکہ مظلومیت کا ذکر کر دینا ہے۔

ان مظلوموں میں نمبر اول پر مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، مولانا کی نفس شہرت میں کلام نہیں، ان کی شخصیت اتنی زبردست تھی کہ اس نے ملک و ملت کے گوشہ گوشہ پر اثر ڈالا ہے، اور ہندوستان کی دنیا ان کے نام کی آواز سے گونج رہی ہے۔ سوال ان کی عمومی شہرت کا نہیں، انکی ادبی شہرت کا ہے — تاریخ ادب اردو میں اب تک خدا معلوم چھوٹی بڑی کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، ان میں سے کتنوں میں اُن کے ادبی مرتبہ کا ذکر ہے؟ اسے بھی جانے دیجئے۔ ان کا نام نامی ہی کتنی ادبی کتابوں میں آیا ہے؟ ان کی کتابیں، سرکاری و خانگی، ملکی و ملّی، کتنی درسگاہوں کے، ادبی نصاب

میں داخل ہیں؟ کتنوں کو اس کا علم ہے کہ ان کی تحریریں اردو ادب و انشاء کے بہترین نمونوں کا کام دے سکتی ہیں؟ کتنے اس سے باخبر ہیں کہ مولانا کی سیاسی سربلندیوں اور مذہبی عظمتوں میں ایک بڑی حد تک دخل مولانا کے ادب و انشاء کو بھی رہا ہے؟ کتنوں کی رسائی اس حقیقت تک ہے کہ موافقین ہی نہیں، مولانا کے مخالف بھی ان کے کمال انشاء کے قائل و معترف، اور ان کے زورِ قلم سے متاثر رہے ہیں؟ بہتوں کے کان میں یہ بھنک بھی پہنچی ہے کہ مولانا کی نظر، زبان، خصوصاً زبان دہلی کے کن کن گوشوں اور باریکیوں پر تھی، اور انھیں زبان کے محاورات، کنایات، تلمیحات پر کس درجہ عبور حاصل تھا!

مولانا ابوالکلام کے ساتھ ہی یاد دہلی کے ایک دوسرے مظلوم ادیب خواجہ حسن نظامی کی آجاتی ہے۔ ان کے قلم میں آزاد کی سی عظمت و بلندی نہ تھی، لیکن سلاست اور دلنشینی، درد و گداز، ترنم و شیرینی، تاثیر و کشش میں خواجہ صاحب کسی سے نیچے اور کسی سے پیچھے نہ تھے، ابوالکلام اگر خواص کے ادیب تھے، تو خواجہ صاحب عوام کے۔ اور دہلی کی مستند اور ٹکسالی زبان پر عبور میں بھی یہ اپنی نظیر آپ تھے۔ عام اردو داں طبقہ کے سکھانے، پڑھانے، اسے مہذب و تک شائستہ بنانے، اسے ادب قاعدہ سے لگانے میں جو حصۂ عظیم خواجہ صاحب کا رہا ہے، وہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ اور کسی ایک انسان کے لیے یہی باعث فخر ہو سکتا ہے۔ رنج کی بات ہے کہ ایسے محسن اردو کو اس درجہ بھلا دیا گیا! اور بھلا کیا دیا گیا، انھیں اردو ادب کے تاریخ نویسوں نے یاد ہی کب رکھا تھا! کسی تاریخ ادب میں غریب کا نام تک بھی شاید نہیں آنے پایا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی دینی، علمی، فاضلانہ، محققانہ شخصیت ہندوستان و پاکستان ہی کو نہیں، کہنا چاہئے کہ عالم اسلام کو مسلّم ہے، لیکن انتہائی حق تلفی سید صاحبؒ کی ادبی حیثیت سے ہو رہی ہے، مدیر معارف اور مصنف نقوش سلیمانی کی ذات اس کا حق رکھتی تھی کہ اس کے ادب با

نصابِ ادب کے مختلف کلاسوں میں داخل ہوتے، اور تاریخ ادب کے اوراق میں اس کا
نام ادب و احترام کے عنوان جلی کے ساتھ درج ہوتا۔

محمد علی کا نام ملک و ملت کے بلند پایہ رہنما، اور ایک فعال عوامی لیڈر کی حیثیت
سے ممکن ہے کہ رہتی دنیا تک رہ جائے، اور نہ صرف ہندوستان و پاکستان کے مسلم و غیر مسلم
بلکہ عالم اسلام کے باشندے بھی انھیں خراج عقیدت مدتوں ادا کرتے رہیں۔ جوہر کے شاعرانہ
جوہر، اور ایڈیٹر کامریڈ کی انگریزی انشاء پردازی بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو مسلّم رہے، لیکن
مولانا نے باوجود اردو کے مصنف نہ ہونے کے، اپنے سیکڑوں اردو مقالوں اور خطبوں
سے جو مستقل اثر اپنے وقت کے اردو ادب پر چھوڑا ہے، اس کی طرف سے آنکھ بند کرلینا
ایک اعلیٰ درجہ کی حقیقت ناشناسی ہی ہے، محمد علی کی ہر تحریر، خواہ وہ خفگی اور غصہ
کے ہیجان میں لکھی گئی ہو، یا مسرت و انبساط کے جوش میں، مایوسانہ ہو، یا پُر امید، ہر حال
اور ہر صورت میں اپنے اندر ایک جان رکھتی تھی۔ اور اپنے لکھنے والے کی زندہ متحرک، فعال
جاندار شخصیت کی آئینہ دار بھی ہوتی تھی ــــ ظلم ہے ظلم کہ ایسے جاندار ادیب کو ادب کی
تاریخ میں جگہ نہ ملے۔

دہلی کے راشد الخیری اور لکھنؤ کے رتن ناتھ سرشار دونوں کے نام افسانہ نویس کی
حیثیت سے اب بھی زندہ ہیں، اور افسانہ بھی ادب ہی کی ایک شاخ ہے، لیکن انصاف کا
تقاضا یہ ہے کہ دونوں کے نام، خالص ادب کی تاریخ میں بھی جگہ پائیں۔ افسانوی دل کشی
سے بالکل قطع نظر، دونوں کے ان اوراق میں گویا دہلی اور لکھنؤ کی زبانوں کا عطر کشید
کیا ہوا موجود ہے ــــ اردو زبان کی ترکیبوں، تشبیہوں، استعاروں، تلمیحوں، محاوروں
کے لیے دونوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ریاض خیرآبادی اور حسرت موہانی بھی اس باب میں کم نصیب ہی واقع ہوئے ہیں،
دونوں کی شاعرانہ عظمت مسلّم۔ دونوں کے رتبۂ استادی کا بھی اعتراف سب کو، لیکن طلبۂ ادب
کی اس محرومی کو کیا کہیے کہ نہ ریاض کے ناولوں اور ریاض الاخبار کی زبان کی شستگی و لطافت
کی کسی کو کانوں کان خبر۔ اور نہ حسرت کے اردوئے معلّٰی کی اردو آموزی اور ایک پختہ اور مستقل طرز
نگارش سے کوئی واقف ــــ حضرت اکبر الہ آبادی بہ حیثیت شاعر، شہرۂ آفاق ہیں لیکن شاعر
کی یہ شہرۂ آفاقی ان کی نثاری کے حق میں حجاب اکبر بن گئی، کمتر ہی کسی کو علم ہوگا کہ اکبر ایک زمانہ
میں اودھ پنچ میں خوب داد نثر نگاری دے چکے ہیں، اور ان کے خطوط کے جتنے مجموعے اب تک
چھپ چکے ہیں، وہ چہرۂ ادب کی مشاطگی کے لیے بالکل کافی ہیں۔ چھوٹے، ہلکے پھلکے سبک و
لطیف جملے ادب و انشاء کی جان!

لکھنؤ کے منشی سجاد حسین (اودھ پنچ کے ایڈیٹر اور کئی کئی ناولوں کے مصنف) اور
دہلی کے میر ناصر علی (صلائے عام کے اڈیٹر) بھی عجب کس مپرسی کے شکار ہو کر رہے ہیں۔
صلائے عام کا دائرۂ اشاعت تو خیر پھر محدود تھا، لیکن اودھ پنچ تو اپنے زمانہ میں خوب چمکا۔
وقت کے خواص و عوام دونوں طبقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ آج یہ معلوم ہوتا ہے
کہ جیسے دونوں میں سے کسی کا وجود ہی کبھی نہ تھا ــــ زبان کی صحت کا دونوں کو خاص اہتمام،
بلکہ التزام تھا۔ اور اودھ پنچ، اور اس کے اڈیٹر کے ناولوں کے چٹکلے اور لطیفے تو کہنا چاہیے
کہ زبان زد عام ہو چکے تھے، لیکن وائے زمانہ!

کوئی لیتا نہیں اب ان کا نام

مرزا فرحت اللہ بیگ اور قاضی عبد الغفار تو گویا ابھی کل ہی تک ہمارے درمیان
زندہ، و سلامت تھے۔ اور کس دلآویزی سے، کس خوش نوائی سے چہکتے رہتے تھے۔ "آناً فاناً

ندرِ فراموشی ہو گئے۔ مرزا صاحب کی ٹکسالی اردو کا کیا کہنا۔ اہلِ زبان ہی تھے۔ اور انکی لطیف، جمیل نثر کا کیا پوچھنا، قاضی صاحب گو اہلِ زبان نہ تھے، لیکن اپنی برجستگی، بذلہ سنجی، میں صحت زبان کے اہتمام کے ساتھ کسی اہلِ زبان سے کم بھی نہ تھے۔ حیف کہ اتنی جلد دونوں طاقِ نسیان پر بٹھا دیے گئے۔ ابھی کچھ دن تو دونوں کو بہرحال رونقِ بزمِ ادب رہنا تھا — اور یہ تثلیث مکمل ہو جائے، اگر اس ذیل میں نام عبد المجید سالک کا بھی لے لیا جائے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ سالک مرحوم اخبار نویس ہو پڑے، ورنہ ان کا قلم صحافت سے زیادہ ادب کے میدان میں رواں تھا۔ اور اگر کسی کو ان کے صحافی ہی رکھنے پر اصرار ہو جب بھی انھیں ایک ممتاز ادیب صحافی تو بہرحال ماننا پڑے گا۔

سید محفوظ بدایونی (علیگ) اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (صدر یار جنگ) بھی اپنی اپنی جگہ پختہ قلم ادیب ہوئے ہیں، ایک ظریفانہ رنگ میں، دوسرے سنجیدہ شوخی لیے ہوئے۔ دونوں کے چند مقالے بھی اگر پڑھ لیے جائیں تو ذوقِ سلیم پر جلا ہو جائے۔ اور شریفانہ ادب کے معنی روشن ہو جائیں۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا نام اور کام مدتوں چلا، لڑکوں کی کم سے کم دو نسلوں کو اردو تو انھیں کی ریڈروں کے طفیل آئی۔ جو بڑا کام وہ کر گئے اسے مٹنا کبھی بھی نہ تھا،

الیاس احمد مجیبی بیچارے ع

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

کے مصداق ثابت ہوئے۔ مشہور ہونے ہی کہاں پائے تھے کہ گمنام ہو گئے! لیکن بچوں کے ادب کے لیے جو کام کر گئے، وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ کوئی دوسرا ان کی ٹکر کا نظر نہیں آتا۔

اور مرحومین کی فہرست میں سب سے آخر چودھری محمد علی ردولوی۔ "آخر" ترتیب زمانی

کے لحاظ سے، نہ کہ مرتبہ و حیثیت ادبی کے لحاظ سے۔ لکھنؤ کی پیاری زبان کے ماہر۔ بات بات میں موتی پرونے والے۔ جس نے انھیں نہیں پڑھا، وہ لطف زبان کے چٹخارے سے محروم ہی رہا — اور جی میں آتا ہے کہ خواجہ عبد الرؤف عشرت کا نام خاتمہ پر لا کر ان سارے گمنام و مظلوم خادمانِ ادب پر حسرت کے ساتھ فاتحۂ خیر پڑھ دیجیے۔

زندہ حضرات پر قلم اٹھانا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ اور پھر ماشاء اللہ جب ان کی تعداد بھی خاصی بڑی۔ پھر بھی دو چار نام لیے بغیر تو چارہ ہی نہیں۔ خواجہ محمد شفیع دہلوی ثم لاہوری، سید ہاشمی فرید آبادی ثم لاہوری اور ملا واحدی دہلوی ثم کراچوی اپنے اپنے طرز خاص کے مالک ہیں۔ اور جس ادبی شہرت کے مستحق ہیں، وہ اب تک ان کے حصے میں نہیں آئی ہے۔ واحدی صاحب کا طبعی انکسار انھیں گمنام رکھنے میں مدد دے رہا ہے۔ اور سید ہاشمی کی روشناسی مورخ کی حیثیت سے کچھ اس غضب کی ہوئی کہ ان کے ادبی چہرہ کا رنگ روپ سب ماند ہی پڑ گیا — اور ایسا ہی کچھ حال مہر صاحب لاہوری کا ہے۔ ابو الکلام ثانی تو کوئی اب ہونے سے رہا، پھر بھی ابو الکلامی طرز و اسلوب کی کچھ جھلکیاں اگر نظر آتی ہیں تو مہر ہی کے ہاں۔

آل انڈیا ریڈیو دہلی کے حضرت "آوارہ" (سید آل عبا مارہروی) اپنی ذات سے خود ایک انجمن یا ادارہ ہیں۔ ہر ہر طبقہ کی زبان پر جو عبور کامل انھیں ہے وہ بس ان ہی پر ختم ہے۔ اور میرے لیے تو قابلِ رشک ہے۔ اور زبان سے مراد محض الفاظ کا تحریری استعمال نہیں، بلکہ "تلفظ" اور لب و لہجہ اور آواز کا اتار چڑھاؤ سب اسی میں داخل ہے۔

"من کی موج" کے مصنف کی یہ گمنامی جتنی حیرت انگیز ہے، اتنی ہی طالبۂ ادب کے لیے تاسف انگیز بھی۔

مدیر معارف مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی (مصنف "ادبی نقوش") اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر آفتاب احمد ردولوی بھی صحیح، سادہ، سلیس، شگفتہ زبان لکھنے والوں میں ممتاز ہیں، لیکن اپنے استحقاق سے کہیں کم درجہ میں مشہور — اور ڈاکٹر عابد حسین (جامعہ ملیہ والے) کا ادبی کام گو مقدار و کمیت میں بہت کم ہے۔ لیکن کیفیت و مرتبہ میں بہتوں سے زیادہ بلند — گمنام ترین ہستی ان ادبی مظلوموں کی فہرست میں علی گڑھ کے مرد بزرگ مولوی مقتدیٰ خان شروانی اطال اللہ عمرہ کا ہے، بلکہ عجب نہیں جو بہت سے اس پر چونک پڑیں کہ ان کا نام ادیبوں کے زمرہ میں آیا کیسے!

سب سے آخری نام اس فہرست میں جوش ملیح آبادی ثم کراچوی کا آتا ہے۔ جن کی شاعری کی دھوم دھام نے ان کی نثر نگاری کے چہرے پر گہرا نقاب ڈال رکھا ہے۔ الفاظ کے صحیح و بامحل استعمال پر جو قدرت انھیں حاصل ہے، کم ہی کسی کو ہے۔ اور زبان کے جن جن گوشوں پر ان کی نظر پہنچ چکی ہے، کمتر ہی کسی اور کی پہنچی ہے۔

معارف: مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے مذکورۂ بالا مضمون میں اردو زبان و ادب کی نصابی کتابوں کے مولفین اور اس کے تاریخ نگاروں کی جس فروگذاشت کی جانب توجہ دلائی ہے، اس کے علاوہ بھی بعض باتیں قابل توجہ ہیں جن کا اس مضمون میں ذکر نہیں ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ انکی جانب بھی اشارہ کر دیا جائے۔ نئے ادیبوں میں، ادب کا معیار اور ادب نام ہے صرف ترقی پسند شاعری، افسانہ نگاری اور جدید طرز تنقید کا، نئے بازار میں اسی سکہ کا چلن ہے، اس کے علاوہ ہر سکہ ٹکسال سے باہر ہے، چنانچہ آجکل ہر نو آموز ترقی پسند شاعر، افسانہ نویس اور تنقید نگار شاعر غرّا اور ادیب جلیل ہے، اور دوسرے ادیب و اصحاب قلم، رجعت پسند جنکی نئی بزم ادب میں کوئی جگہ نہیں ہے، اس سے انکار نہیں کہ ادب اور تنقید بھی ایک ترقی پذیر چیز ہے اور دوسرے علوم و فنون

کی طرح اس زمانہ میں اس میں بھی بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے، اور اس کی بعض چیزیں قابل اخذ و استفادہ بھی ہیں جن سے ہمارے ادب میں مفید اضافہ ہوا ہے، لیکن محض ترقی پسندانہ شاعری، افسانہ نویسی اور تنقید نگاری ہی کل ادب نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک حصہ ہے، ادب کے دائرہ کی یہ تحدید خود ترقی پسند ادب کے لیے بھی مضر ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کا دامن افسانہ اور تنقید کے علاوہ ہر قسم کے سنجیدہ لٹریچر سے خالی ہے، اور خالص ادب میں بھی وہ آج تک کوئی ایسی چیز نہ پیش کر سکا جو ہماری کلاسیکل کتابوں کی طرح ادب و تنقید ادب کے نصاب کا کام دے سکے جس کا احساس خود صاحب نظر ترقی پسند ادیبوں کو بھی ہے،

دوسرے ہر زبان اور اس کے ادب کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، اور وہ دوسری زبانوں کے ادبی معیاروں اور تنقیدی پیمانوں کو اسی حد تک قبول کر سکتی ہے جس سے اس کے مزاج میں فرق نہ آنے پائے، جس کا ترقی پسند ادیب بہت کم لحاظ رکھتے ہیں، اور بعض اوقات انکی تنقیدیں اردو زبان کے مزاج سے اس قدر دور ہو جاتی ہیں کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اردو زبان و ادب کی تنقید ہے، بلکہ اس کے جملے، فقرے تک اس سے ہم آہنگ نہیں ہوتے، بیشتر تنقیدوں میں الفاظ کا ذخیرہ زیادہ اور مغز و معنی کم ہوتے ہیں، ان سے ادب کا تجزیہ تحلیل بلکہ اس کا پوسٹ مارٹم تو ضرور ہو جاتا ہے، لیکن خالص ادبی تنقید جس سے ادب کا صحیح ذوق اور اس کی پرکھ پیدا ہو، بہت کم ہوتی ہے، اس سے شاید ہمارے ترقی پسند دوستوں کو بھی انکار نہ ہو کہ ہماری پرانی ادبی اور تنقیدی کتابوں آب حیات، سخندان فارس، مقدمۂ شعر و شاعری، شعر العجم، موازنۂ انیس و دبیر اور کاشف الحقائق وغیرہ سے جو ادبی بصیرت پیدا ہوتی ہے، وہ ترقی پسند ادب کے پورے ادبی و تنقیدی ذخیرے سے نہیں پیدا ہو سکتی خود ترقی پسند ادیبوں میں وہی ادیب ادبی بصیرت اور ادب کا صحیح اور پختہ مذاق رکھتے ہیں، جو قدیم ادب کے

ذوق شناس ہیں، اور اس پر گہری نظر رکھتے ہیں،

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ جو تنگ نظری ہمارے بعض قدیم شعرا، اور ادیبوں میں تھی کہ وہ اپنے دائرے سے ایک انچ بھی باہر قدم نکالنا پسند نہ کرتے تھے، ہر نئی چیز سے بھڑکتے تھے، اور اس کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، وہی تنگ نظری ترقی پسند ادیبوں میں بھی ہے، انھوں نے بھی ادب کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے، اور اپنے حدود میں اپنے طائفہ کے علاوہ کسی کو گھسنے نہیں دیتے اور چونکہ نئی ادبی دنیا پر ان ہی کا قبضہ ہے، اس لیے بہت سے ادیب اور اصحاب علم وقلم اپنے حق سے محروم رہ جاتے ہیں، یہ چیز اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے مضر ہے، اس کی متوازن اور صحت مند ترقی دونوں کے اشتراک و تعاون، ایک دوسرے کی حق شناسی وقدر دانی اور جدید وقدیم ادب کے اچھے عناصر کے معتدل امتزاج ہی سے ہو سکتی ہے،

نارجیل سے نخیل تک

از

جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

۱

خلیج عربی کے ساحلی مقامات کے علاوہ ہندوستان کے لوگ جزیرہ نمائے عرب کے اندرونی مقامات میں بھی رہتے تھے اور ان کی مستقل آبادیاں تھیں، چنانچہ عرب کے وسطی علاقہ نجد میں ہندوستانیوں کا پتہ چلتا ہے جو وہاں آباد تھے، اور عہد رسالت کے بعد تک اپنے مذہب پر قائم رہے، اور ردت کے زمانہ میں کفار و مشرکین اور مرتدین کی یوں مدد کی کہ ان کو ہندوستان کے بنے ہوئے اسلحۂ جنگ دیے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں استعمال کیے گئے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عربوں نے یہ ہندوستانی اسلحہ ان سے خریدے ہوں یا ہندوستان سے لے گئے ہوں، مگر غالب گمان یہی ہے کہ انھوں نے عربوں کی مدد کے لیے خود ہی یہ پیش کش کی تھی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد جب نجد کے علاقہ یمامہ میں مسیلمہ کذاب نے کھل کر مسلمانوں سے مقابلہ کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو مسیلمہ کذاب اور اسکی فوج سے لڑنے کے لیے روانہ فرمایا، جب وہ یمامہ کے قریب پہنچے تو مسیلمہ کذاب کی قوم بنو حنیفہ کی ایک جماعت سے مڈبھیڑ ہوئی، اور مجاعہ بن مرارہ بن سلمی کے علاوہ سب قتل ہوئے، حضرت خالدؓ نے مجاعہ کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ لیا اور یمامہ سے ایک میل دوری پر پڑاؤ ڈالا، جب یمامہ والوں کو خبر ہوئی تو مقابلہ کی نیت سے باہر نکلے، اس وقت ان کے ہاتھوں میں تلواریں چمک رہی تھیں، ان کو دیکھ کر حضرت خالدؓ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ آپس ہی میں لڑ گئے ہیں، جب مسلمان فوجوں سے اس کا تذکرہ کیا تو مجاعہ نے بتایا کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یمامہ کے لوگ جنگ کی تیاری میں اپنی ہندی تلواریں صاف کر رہے ہیں اور انکو دھوپ دکھا رہے ہیں۔ بلاذری نے لکھا ہے:

فرأى خالد البارقة فيهم، فقال
يا معشر المسلمين قد كفاكم الله مؤونة
عدوكم، ألا ترونهم وقد شهر بعضهم
السيوف على بعض وأحسبهم قد اختلفوا
ووقع بأسهم بينهم. فقال مجاعة هو
في حديثه: كلا ولكنها الهندوانية خشوا
تحطمها فأبرزوها للشمس لتلين متونها [لہ]

حضرت خالدؓ نے انکے اندر تلواروں کی چمک دیکھی تو
فرمایا کہ اے مسلمانو! اللہ نے تم کو دشمن کی مصیبت سے
نجات دیدی، وہ دیکھو دشمن آپس ہی میں ایک دوسرے پر
تلواریں کھینچے ہوئے ہیں، میرا خیال ہے کہ ان میں
اختلاف ہوگیا ہے اور وہ آپس میں لڑ پڑے ہیں، یہ سنکر
مجاعہ نے کہا یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ ہندستانی تلواریں
ہیں جنکو انھوں نے دھوپ میں رکھکر صاف کرنا چاہا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یمامہ اور آس پاس میں آباد ہندستانیوں نے مسیلمہ کذاب اور اسکے متبعین کو ہندستان کی بنی ہوئی بہترین تلواریں دی تھیں، جو عرب میں قدیم زمانہ سے مشہور تھیں، یمن کے مشہور شہر نجران میں بھی عہد رسالت میں بکثرت ہندستانی آباد تھے، اور نجران کے عرب ان کی زندگی اور لباس وغیرہ سے بڑی حد تک متاثر تھے، اس کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جملہ سے ملتا ہے، وہ یہ ہے کہ ربیع الآخر یا جمادی الاولیٰ سنہ ۱۰ نبوت میں آپ نے حضرت خالدؓ کو نجران کے قبیلہ بنی حارث بن کعب کے پاس دعوت اسلام کے لیے روانہ فرمایا، حضرت خالدؓ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور انھوں نے بلا تردد قبول کرلی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو لکھا کہ تم بنی حارث بن کعب کا ایک وفد لیکر مدینہ آجاؤ، چنانچہ وہ چھ آدمیوں پر مشتمل ایک وفد لیکر دربار نبوت میں حاضر ہوئے:

فلما قدموا على رسول الله صلى الله عليه وسلم
رآهم قال من هؤلاء القوم كأنهم
رجال الهند، قيل يا رسول الله هؤلاء
رجال بني الحارث بن كعب [لہ]

جب وفد کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے
اور آپ نے ان کو دیکھا تو فرمایا یہ کون لوگ ہیں جو ہندستان
کے لوگوں جیسے ہیں، عرض کیا گیا یا رسول اللہ یہ
بنی حارث بن کعب کے آدمی ہیں۔

اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہندوستان کے لوگوں کی شکل و صورت

لہ فتوح البلدان ص ۹۰ طبع مطبعہ مصریہ ازہر۔ لہ سیرۃ ابن ہشام ج ۴ ص ۵۹۲، ۵۹۳ طبع مصطفیٰ مصر و تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۶، تاریخ طبری میں القوم الذین کأنہم ۔۔ ہؤلاء بنو الحارث ہے۔

سے اچھی طرح واقف تھے، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نجران اور اس کے اطراف میں ہندوستانیوں کی تعداد زیادہ تھی، اور مقامی لوگوں پر ان کا شبہہ ہونے لگتا تھا، یا وہ ہندوستانیوں سے میل جول کی وجہ سے لباس و ہیئت میں ان کے مشابہ معلوم ہوتے تھے۔

عرب کے مغربی علاقہ حجاز میں بھی ہندستان کے باشندے موجود تھے، خاص طور سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے عرب باشندے ان سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ ابتدائے اسلام میں جب مکہ مکرمہ میں کفار قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تو ابو طالب نے اس زمانہ میں سینکڑوں اشعار کا ایک قصیدہ کہا جس میں یقین دلایا کہ میں اپنے بھتیجے کی مدد و حفاظت سے باز نہیں آسکتا، اس قصیدہ کے ایک شعر میں ہندوستانی کا تذکرہ یوں کیا ہے:

بضرب ترى الفتيان فيه كأنهم ضواري أسود فوق لحم خرادل

ایسی جنگ کہ اس میں نوجوان حملہ آور شیر معلوم ہوتے ہیں۔

بني أمة محبوبة هندكية بني جمح عبيد قيس بن عاقل [لہ]

ہندستانی دل پسند باندی کے بیٹوں کو مارتے ہیں یعنی بنی جمح کو جو قیس بن عاقل کے غلام ہیں،

عہد رسالت میں مکہ مکرمہ میں ہندوستانیوں اور جاٹوں کے رہنے کی ایک اور سند حدیث میں ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ جاٹوں سے اچھی طرح واقف تھے، وہ انکی شکل و صورت اور لباس و ہیئت کو خوب جانتے تھے، ابتدائے اسلام کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بطحاء مکہ کی طرف لے گئے، یہاں انھوں نے جاٹ دیکھے جو اپنی شکل و صورت اور ہیئت میں ہندوستان کے جاٹ معلوم ہوتے تھے، حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے

فبينا أنا جالس في خطي إذ أتاني رجال
كأنهم الزط أشعارهم وأجسامهم

میں اپنے حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے پاس کچھ لوگ
آئے جو اپنے بال اور جسم میں جاٹ معلوم ہوتے تھے

لہ سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۷۶ مطبوعہ ۱۳۵۵ھ مصر

ولا اری عورۃ ولا اری قشرۃ (ترمذی ابواب الامثال)[1] میں ان کا ستر اور کھال نہ دیکھ سکا،

حضرت ابن مسعودؓ کی اس تمثیل وتشبیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں رہ کر جاٹوں کی شکل وشباہت سے بخوبی واقف تھے،

مکہ مکرمہ کے بعد حجاز کا دوسرا مرکزی شہر مدینہ منورہ ہے، جہاں بحرین وعمان اور عراق وشام وغیرہ سے ہر قسم کا تجارتی کاروبار ہوتا تھا، عہد رسالت میں مدینہ منورہ میں ہندوستانیوں کے بارے میں کوئی واقعہ نہیں مل سکا، مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی جاٹ موجود تھے، چنانچہ امام بخاریؒ نے الادب المفرد کے باب "بیع الخادم من الاعراب" میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پروردہ حضرت عمرہ انصاریہؒ سے روایت کی ہے کہ

ان عائشۃ رضی اللہ عنہا دبرت امۃ لہا، فاشتکت عائشۃ، فسأل بنو اخیہا طبیبا من الزط[1]	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ایک باندی کو مدبر فرمایا، اسکے بعد آپ بیمار ہوگئیں تو آپکے بھتیجوں نے اس سلسلے میں ایک جاٹ طبیب سے مراجعت کی،

یہ روایت امام ابو عبداللہ حاکمؒ نے المستدرک میں بھی بیان کی ہے[2]، غالباً یہ واقعہ جیسا کہ ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں جاٹ رہتے تھے، جن میں سے بعض دوا علاج بھی کرتے تھے، اور اغلب یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے سے یہاں آباد تھے۔

عرب کے شمال ومغرب میں بھی ہندوستانیوں کا نشان ملتا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تبوک کے آس پاس یہ لوگ رہتے تھے، چنانچہ امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو رہم رضی اللہ عنہ کی طویل ملاقات کا ذکر کیا ہے، جس میں رسول اللہ

[1] الادب المفرد ص ۲۷، مطبعہ تازیہ مصر [2] فضل اللہ الصمد ج ۱ ص ۲۶۰

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے قبیلہ بنی غفار کے اس غزوہ میں نہ شریک ہونے والوں کے بارے میں سوال کیا اور ابو رہم نے جواب دیا،

فقال ما فعل النفر الحمر الطوال الثط، قال تخلف ثته تخلفهم قال فما فعل السود الجعاد القصار الذين لهم نعم بشبكة شرخ الخ[1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس سرخ جماعت کا معاملہ کیا رہا جن کے شکم بڑے ہیں، انہوں نے عرض کیا کہ وہ غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہوئے، پھر آپ نے دریافت فرمایا ان سیاہ رنگ، گھونگھر بالوں والے پستہ قد لوگوں کا کیا حال ہے جن کے جانور مقام شبکہ شرخ میں ہیں،

غالب گمان یہ ہے کہ اس حدیث میں "النفر الحمر الثط" سے مراد بنو غفار کے ہندوستانی غلام اور موالی ہیں اور السود الجعاد القصار سے مراد حبشی غلام اور موالی ہیں۔

احمر جس کی جمع حمر، احامر اور احامرۃ آتی ہے، اور حمرہ عرب میں عجمی موالی کو کہتے تھے، جن میں ہندوستان کے لوگوں کی کثرت ہوا کرتی تھی،

یہ مختصر سا بیان ان ہندوستانیوں اور ان کی آبادیوں کا ہے جو عرب میں آباد تھے، اگر احادیث اور تواریخ وسیر کی کتابوں کا تفصیلی مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے تو مزید باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔

(باقی)

[1] الادب المفرد امام بخاری ص ۱۱۲

ادبیات

ظہورِ قدسی

از جناب یحییٰ اعظمی

مبارک خانۂ فطرت کے شہ کار حسیں آئے
مبارک خاتمِ ہستی کے تابندہ نگیں آئے

مبارک آب و گِل کے اک نگارِ دلنشیں آئے
خوشا حسنِ ازل کے پیکرِ ناز آفریں آئے

مبارک مطلعِ کونین کے ماہِ مبیں آئے
سراپا نور، رشکِ طور، رخشندہ جبیں آئے

شبستانِ دل کے جسکی اک کرن سے جگمگا اٹھے
وہ خورشیدِ رسالت، شمعِ عرفان و یقیں آئے

نہاں تھی جس کی بعثت میں نویدِ رحمتِ عالم
وہ شرحِ نصِ "الا رحمۃ للعالمیں" آئے

سلام ان پر جو پیکر تھے سراپا رفق و رافت کے
درود ان پر جو از سر تا قدم لطف آفریں آئے

زمانہ میں کسے انکار کی اب تاب باقی تھی
کہ خود پیشِ نظر آئینۂ حق الیقیں آئے

صحائف جن کے مقدم کی بشارت دیتے آئے تھے
زہے ساعت وہ فخرِ اولین و آخریں آئے

ہے شاہد جن کی محبوبی پہ سبحان الذی اسریٰ
وہ جن پر ہے فدا خود صاحبِ عرشِ بریں آئے

محمدؐ یعنی وہ مزمل و مدثر و یٰسین
محمدؐ یعنی وہ محمودِ رب العالمیں آئے

منور ہوگیا دم بھر میں ظلمت خانۂ گیتی
کہ خود پیغمبرِ دیں، صاحبِ نورِ مبیں آئے

ظہورِ قدس جن کا ہے فروغِ تازۂ ہستی
وہ صبحِ نو بہار و رشکِ شامِ عنبریں آئے

عبارت جس سے شمعِ آخریں ہے بزمِ گیہاں کی
وہ ختم الانبیا آئے، وہ ختم المرسلیں آئے

وہ مقصودِ ملائک، موردِ الہامِ ربانی
وہ مولائے رسالت، مہبطِ روح الامیں آئے

ترے مقدم سے روشن ہوگئی پھر بزمِ امکانی
درودِ بیکراں تجھ پر ہو اے محبوبِ ربانی

"کیفِ حضوری"

از جناب زائرِ حرم حمید صدیقی

گہے نغمہ سنجی، گہے آہ و زاری
ہمہ کیف و مستی، ہمہ ہوشیاری

زہے لذتِ دیدِ محبوبِ باری
تصور پہ بھی بیخودی سی ہے طاری

کہاں لے کے آئی محبت ہماری

دلم گشت بیگانۂ راحت و غم
خوشا جذبِ کامل کہ از خود گذشتم

چہ گویم، حدیثِ حضوری چہ گویم
بیاں کیا ہو جوشِ مسرت کا عالم

بس اک دیدہ و دل پہ حیرت ہے طاری

تپیدم چو پروانۂ شمعِ محفل
زدل محو شد ہر تمنائے باطل

چہ پرسی ز کیفیتِ دیدِ کامل
حضوری ہوئی جسقدر دل کو حاصل

بڑھی اور بھی شوق کی بیقراری

دلم آتشِ عشق سوزاں چو مشعل
لبم نغمہ پیرائے نعتِ مُسجّل

بذوقِ تمام و بشوقِ مکمل
زباں پر درود و سلامِ مسلسل

کبھی سجدہ ریزی کبھی اشکباری

زبیتابیِ ذوق و شوقِ نہفتہ
جنوں آشنائے چہ دردانہ سفتہ

دل و جاں نثارش کہ مستانہ گفتہ
حمیدؔ اپنا دل مثلِ گل ہے شگفتہ

یہ مہکی فضائیں، یہ بادِ بہاری

مطبوعات جدیدہ

مرعاۃ المفاتیح ۔ از شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی، صفحات ۵۳۸، تقطیع کلاں، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت ۱۸؍ ۔ پتہ مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی، مبارک پور، اعظم گڈھ ۔

پچھلی دو ڈھائی صدیوں میں علمائے ہند نے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، اس کی مثال کسی دوسرے اسلامی ملک میں نہیں ملتی، اس کا اعتراف خود عرب ممالک کے ممتاز علماء کو بھی ہے، احادیث نبوی کی متداول کتابوں میں مشکل ہی سے کوئی ایسی کتاب ہوگی، جس کی شرح، حاشیہ یا ترجمہ یہاں نہ کیا گیا ہو، اس فن کی بعض اہم ترین کتابیں سب سے پہلے یہیں سے طبع ہوئیں، مشکوٰۃ شریف جو اپنی افادیت کی وجہ سے ہندوستان میں ہمیشہ متداول اور داخل نصاب رہی، اس کی بھی یہاں فارسی، عربی اور اردو میں کئی شرحیں لکھی گئیں، ان ہی میں ایک مرعاۃ المفاتیح بھی ہے، جو اپنی ضخامت اور خصوصیات کی بنا پر تمام شروح مشکوٰۃ میں ممتاز مقام رکھتی ہے، اس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور تیسری جلد پریس میں ہے، غالباً یہ ۵ جلدوں میں مکمل ہوگی، اس کے شارح مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی ممتاز عالم اور سیرت البخاری کے مصنف مولانا عبد السلام مبارکپوری کے صاحبزادے اور ترمذی شریف کے مشہور شارح مولانا عبد الرحمن صاحب مبارکپوری کے تربیت یافتہ ہیں، اس لیے اس شرح میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جو اس فن کے لیے ضروری ہیں، مولانا نے اس میں متکلمانہ اور فقیہانہ انداز بحث اختیار کرنے کے بجائے محدثانہ طرز اختیار کیا ہے، یعنی لغات کی شرح،

مفہوم کی تعیین، متن وسند کی تحقیق اور اس کی معنویت اور روح پر زیادہ زور دیا ہے، فقہی مسالک کا ذکر بھی کیا ہے، مگر بیان میں تیزی اور تلخی نہیں آنے پائی ہے، اور ہر مسلک کو اس کے ماخذ سے نقل کرنے کی کوشش کی ہے، مجمل طور پر کتاب ان خصوصیات کی حامل ہے،

(۱) ہر حدیث پر انھوں نے نمبر دیے ہیں، اس لیے کسی حدیث کے تلاش کرنے اور حوالہ دینے میں بڑی آسانی ہوگی اور کتاب اور ابواب کی احادیث کے شمار کرنے میں بھی سہولت ہوگی (۲) اس میں تین فہرستیں ہیں، ایک ابواب، فصول اور احادیث کی، دوسری اسماء صحابہ و تابعین کی، تیسری اکن کی (۳) جن صحابہ اور تابعین سے اس میں روایتیں آئی ہیں، ان کے مختصر حالات دیے گئے ہیں (۴) پہلے حدیث کے معنی و مفہوم کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے بعد اس سے جو مسئلے مستنبط کیے گئے ہیں، ان کی تفصیل کی گئی ہے، اور اس حدیث کا جو غلط مفہوم لیا گیا ہے، اسکی تردید کی ہے، اس سلسلہ میں مصنف نے جس فقہی مسلک کو مرجح سمجھا ہے اس کے وجوہ ترجیح بھی بیان کر دیے ہیں۔ گو اس سلسلہ میں مصنف کا قلم کہیں کہیں اپنی عام روش سے ہٹ گیا ہے، مگر غیر متوازن نہیں ہوا ہے (۵) جس حدیث کی شرح میں ان کو دوسری کتب حدیث اور کتب فقہ سے مدد لینے کی ضرورت ہوئی ہے، بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ ان سے مدد لی ہے (۶) صاحب مشکوٰۃ سے احادیث کی تخریج میں جہاں تسامح ہو گیا ہے، اسکی نشاندہی بھی کر دی ہے، ان کے علاوہ بھی بہت سی خصوصیات ہیں، اس شرح کی اشاعت سے شروح حدیث کے ذخیرہ میں ایک نادر اضافہ ہوا ہے، یہ شرح ہر مدرسہ اور کتبخانہ کی زینت بنانے کے لائق ہے۔

اُردو مثنویاں ۔ از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ضخامت ۳۸۴، کتابت و طباعت بہتر، مع گرد پوش، ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، قیمت : ۶؍

شعرائے اردو نے غزل کے بعد جس صنف پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی وہ مثنوی ہے، مگر افسوس ہے کہ

اس صنف کے بارہ میں کوئی مفصل کام نہیں ہوا تھا، ڈاکٹر نارنگ صاحب نے بڑی خوش سلیقگی سے اردو کی مشہور مثنویوں کے محرکات، ماخذ اور انکے قصوں کے مندرجات کی تفصیل پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان مثنویوں کا نہ صرف ایک ادبی مقام ہے بلکہ ان سے اخذ و قبول، قوموں کے اختلاط و اشتراک اور تہذیب و تمدن کے بناؤ سنگار کا بھی علم ہوتا ہے، ان مثنویوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمان شعرا نے اسلامی قصوں کی روایات کے ساتھ ہندوستانی کہانیوں کو بھی قبول کرنے اور ان کو اردو کا جامہ پہنانے میں کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیا، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بہت سی ہندوستانی کہانیاں انہی مثنویوں کے ذریعہ زندہ ہوئیں، اس کتاب سے اردو کے تحقیقی و تاریخی ذخیرہ میں ایک عمدہ اضافہ ہوا ہے جس کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف اور مکتبہ جامعہ دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں، دلی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو بھی قابلِ ستائش ہے کہ اس کے متوسلین کی وجہ سے اردو زبان کے سلسلہ میں دلی کی قدیم روایت قائم ہے،

موجِ نسیم - از اختر مسلمی، ضخامت ۱۱۲، کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت: عہ۔ پتے:
(۱) اختر مسلمی، پھول پور، اعظم گڈھ (۲) نصیر الحق شمیم بک ڈپو، سرائمیر، اعظم گڈھ۔

یہ ایک نوجوان شاعر اختر مسلمی کی غزلیات کا مجموعہ ہے، جو موجودہ دور کے نوجوان شعرا میں غزلگوئی کا ستھرا مذاق رکھتے ہیں، ان کے کلام میں تغزل کی تمام خوبیاں ہیں، انھوں نے طویل بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں اور متوسط اور چھوٹی بحروں میں بھی، قافیہ کے لیے انھوں نے آسان زمینیں بھی اختیار کی ہیں اور سنگلاخ زمینوں میں بھی اشہبِ قلم کو دوڑایا ہے، اور ہر میدان میں کامیاب ہوئے ہیں، خاص طور پر چھوٹی بحروں کی بعض غزلوں میں تو بقول آزاد تلوار کی تیزی اور نشتر کی آبداری موجود ہے، انھوں نے جو سیاسی غزلیں کہی ہیں، وہ سیاسی غزل گوئی کا اچھا نمونہ ہیں، ان میں انھوں نے "در حدیث دیگراں" ہندوستان کے مظلوموں کے جذبات و خیالات کی بڑی عمدہ ترجمانی کی ہے، ان سب غزلوں میں زبان و بیان کی خوبیاں موجود ہیں، امید ہے کہ یہ مجموعہ ہر طبقہ میں مقبول ہوگا۔

"م، ج"

جلد ۹۰۔ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۲ء۔ عدد ۳

مضامین